تدریس وتربیت کے موضوع پر حضرات اکابر علماء کرام کے ارشادات

- حضرت مولانا شمس الحق رحمۃ اللہ علیہ
- حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا عبدالرؤف غزنوی صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا مفتی ابولبابہ صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی رحمۃ اللہ علیہ
- حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب دامت برکاتہم
- حضرت مولانا نور البشر صاحب دامت برکاتہم
- فضیلة الشیخ موسی العراقی ادام اللہ مجدہ

ناشر

مدرسہ عثمانیہ

للعلوم الدینیہ ــــــــ بہادرآباد کراچی

34940897-34930170
0322-3719333

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

بفضلہٖ تعالیٰ جل مجدہٗ امت مسلمہ میں علم دین کی طلب نمایاں ہو رہی ہے۔ وہ نوجوان بھی ہیں جو خود علمِ دین حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی اولاد کو علم دین سے بہرہ ور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس طلب کی بنا پر اللہ پاک کے کرم سے بڑی تعداد میں دینی مدارس کا وجود نظر آ رہا ہے۔ بنات میں شرعی حدود کے ساتھ علم دین حاصل کرنے کا اچھا رجحان پیدا ہوا تو دیکھتے دیکھتے طالبات کیلئے بھی بڑی تعداد میں مدارس بن گئے۔

مدارس کی اس کثرت میں تعلیم کے عمدہ معیار کے لئے مختلف مشکلات سامنے آ رہی ہیں جن میں غالباً سب سے اہم بات تجربہ کار اساتذہ ومعلمات کی کمی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ جس تیز رفتاری سے مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے ہر مدرسہ کے لئے اس رفتار سے ایسے اساتذہ کیسے میسر آتے جو اپنے اسلاف کے طرز پر اہل نسبت ہوں اور فن تدریس کی بڑی خوبیوں کے حامل ہوں۔ پہلے ہر مدرسہ میں ایسی شخصیات ہوتی تھیں اور اب ان کی کمی واضح ہے۔

اپنی اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے مدرسہ عثمانیہ کے اساتذہ وکارکنان نے سوچا کہ ہمیں فن تدریس میں اپنے اکابر سے استفادہ کی راہ نکالنی چاہئے۔ مناسب اوقات میں اساتذہ تو ان حضرات کی خدمت میں حاضری کے مواقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن معلمات کے لئے ایسے مواقع بہت نادر ہونگے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اکابر اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر معلمین ومعلمات کے لئے ایک دورۂ تدریبیہ کی درخواست کی جائے اور وقت لیا جائے۔ حضرات نے بہت شفقت اور حوصلہ افزائی کا معاملہ فرمایا اور ایک روزہ دورۂ تدریبیہ بروز جمعرات مطابق ۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء منعقد ہوا جس میں حضرت مولانا شمس الحق رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مفتی نظام الدین شامزئی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق صاحب دامت برکاتہم، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہٗ العالی، اور حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب غزنوی مدظلہٗ العالی سے ہمارے اساتذہ ومعلمات کو استفادہ کا موقع میسر آیا۔ اس وقت قریب کے مدارس کے معلمین ومعلمات کو بھی عموم فائدہ کے لئے شرکت کی درخواست کی گئی۔ الحمدللہ ایک مناسب

تعداد نے شمولیت فرمائی اور بہت فائدہ محسوس کیا۔

بعد میں بار بار تقاضہ اٹھتا رہا کہ ایک اور دورہ منعقد ہو جائے لیکن تعلیمی سال کی ابتدا میں ہو۔ وقت گزرتا گیا اور ابتدائی سال کی مصروفیات کی وجہ سے موقع نہ نکالا جاسکا۔ آخر کار ۲۷/۲۸/ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۲/۱۳/ مئی ۲۰۱۰ء دو روزہ دورہ کا انعقاد ممکن ہوسکا۔

اساتذہ ومعلمات کو اکابر کے ارشادات سے بہت فائدہ ہوا۔ بعض اکابر نے ماحول کے رنگ واثر کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ ایسی مجالس تو تین چار ماہ بعد ہوتی رہنی چاہئیں۔ اکثر شرکاء نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ان بیانات کی طباعت ہو جائے تو بہت دیر اور دور تک فائدہ پہونچے گا اس لئے ان اکابر کی اجازت لے کر یہ بیانات شائع کئے جارہے ہیں۔

۲۰۰۳ء والے محاضرہ کے پانچ بیانات میں سے تین بیانات بھی شامل کئے جارہے ہیں۔ جن میں سے دو حضرات جوارِ رحمت میں پہونچ چکے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالرؤف غزنوی صاحب مدظلہ العالی کا بیان شائع کیا جارہا ہے۔ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کے ۲۰۱۰ء کے دورہ کے بیانات زیادہ مفصل ومفید ہیں اور وہ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

اللہ جل شانہٗ تمام معلمین ومعلمات کو اپنے فرائض منصبی بخوبی ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
(آمین)

محمد یامین
(مہتمم) مدرسہ عثمانیہ بہادرآباد کراچی
۱۳/ شوال ۱۴۳۱ھ

حضرت مولانا شمس الحق رحمۃ اللہ علیہ

﴿مورخہ ۱۱ ستمبر بروز جمعرات ۲۰۰۳ء﴾

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ اجمعین امابعد!فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم لا تحرك به لسانك لتعجل به، ان علینا جمعهٗ وقرآنه، فإذاقرأنٰهُ فاتبع قرآنه، ثم ان علینا بیانه ۔

حضرات علماء کرام معزز کارکنانِ مدارس، سامعین، طالبات ومعلمات! اس وقت اس مجلس کے انعقاد کا موضوع، غرض وغایت آپ کے علم میں آچکا ہوگا ۔ مجھے مسرت اور خوشی ہے اللہ نے ان کے قلوب میں یہ القاء فرمایا اس کی شدید ضرورت ہے اور ہماری توجہات کم ہیں ۔ پہلے مدارس کم تھے لیکن صاحب علم پیدا ہوتے تھے ۔ آج درسگاہیں بے شمار ہیں لیکن علم کے اندر انہماک، تعمق، رسوخ کم ہو گیا ۔ ہر فن مولا ہونا تو بڑے دور کی بات ہے ۔

تحصیل علم کا مقصد:

اللہ نے اس طرف متوجہ فرمایا کہ اس کمی کی تلافی ہونی چاہئے علم کا اور علما کا مقصد پورا ہونا چاہئے ۔ جہاں تک میں نے غور کیا اس کمی کا ایک سبب تکوینی ہے ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے علم مرتفع ہوتا جائے گا، علماء کی پیداوار ختم یا کم ہوتی جائے گی ۔ ایک زمانہ آنے والا ہے جہل اتنا عام ہوگا کہ لوگوں کو امام بھی نہ ملے گا ۔ یہ تکوینی امر ہے ہو کر رہے گا ۔ لیکن جتنا علم میسر ہے وہ تو نافع بنے اسکے تقاضے تو پورے ہوں، اسکے مقاصد پورے نہیں ہو رہے ۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ علم دین اور علم دنیا دونوں کے مقاصد جدا جدا ہیں ۔ دنیاوی علوم کے مقاصد کچھ اور ہیں اور دینی علوم کے مقاصد کچھ اور ہیں ۔ اگر مقاصد نظر سے اوجھل ہو جائیں تو اس چیز کے حصول میں دلچسپی باقی نہیں رہتی اور محنت میں کمی آجاتی ہے ۔ دنیاوی علوم حاصل کرنے والوں کی نظر میں مقاصد واضح ہیں ۔ مال و دولت، منصب جن کے حصول کیلئے وہ سرتوڑ کوشش اور مشقتیں کرتے ہیں ۔ دینی علوم کے مقاصد متعین ہیں اہم مقصد میراث

نبوی کی حفاظت، یہ دینی علوم کی تحصیل کا مقصد ہے تاکہ اسکے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے رابطہ قوی تر ہوجائے۔ میراث نبوی سے نہ آپکو مال ملے گا نہ دولت اتنی گھٹیا چیزوں کی امید رکھنا اس میراث نبوی کی توہین ہے۔ اس سے قرب خداوندی، شفاعتِ نبویؐ اور قرب رسول مقصود ہونا چاہیے۔ میراث نبوی حاصل کر کے نوکری، مزدوری، منصب مقصود ہو تو ہم نے میراث نبوت کو پامال کیا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ **ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما انما ورثوا العلم**۔ انبیاء کی میراث درہم دینار نہیں، علم ہے۔ تو یہ ہے دینی علوم سے مقصود۔

دنیاوی علوم والوں نے مقصد کو پیش نظر رکھا اور علوم دینیہ حاصل کرنے والوں کی نظر سے مقصد اوجھل ہوگیا۔ مقصود سے آنکھیں بند کرلیں بلکہ قلب ماہیت کرڈالا۔ بالکل الٹا مطلوب بنالیا۔ لہٰذا اکثر طلباء کا دل ودماغ اس گردش میں رہتا ہے کہ دنیاوی منصب کس طرح ملے گا۔ اسکی فکر کم ہوتی ہے کہ شیخ الہند کی طرح دین کے خادم بنیں، مولانا شبیر احمد عثمانی کی طرح خادم بنیں اپنی زندگی وقف کردیں۔

طالب علم سے پوچھو مقصد کیا ہے؟ کہے گا۔ B.A M.A کا امتحان دے لوں PHD کرلوں پھر کیا ہوگا کالج میں لیکچرار بن جاؤں بڑے عہدے پر پہنچ جاؤں۔ آپ اس کی شہادت دیں گے۔ آپ دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں بہت کم طلباء ملیں گے جو کہیں کہ خالص ملا، داعی اور مدرس بنیں گے۔ شیخ الہند، شیخ الاسلام کے نقش قدم پر چلیں گے۔

جب نصب العین بدل جائے مقصد علم بدل جائے تو ظاہر ہے دلچسپی ختم، محنت کم۔ آج طلباء کا یہ حال ہے کہ اتنے نمبر حاصل کریں کہ وظیفہ روٹی بند نہ ہو۔ سند مل جائے، وفاق میں کامیاب ہوجائیں۔ استعداد کیسے پیدا ہو، ٹھوس علم کیسے آئے، کتابیں کیسی پڑھی جائیں، اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ رواروی کا معاملہ ہے سند لیکر کالج، یونیورسٹی کے چکر کاٹ رہے ہیں۔

شان علوم نبوت انکساری سے، تواضع سے، محنت، جفاکشی سے اور دنیاوی مشکلات جھیلنے سے آتا ہے۔ اکابر فرماتے ہیں: وارث مورث کی ہر ہر چیز میں شریک ہوتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو نبی ﷺ کا وارث قرار دیتے ہیں لیکن نبی علیہ السلام نے علوم کو دنیا میں پھیلانے کیلئے دعوت کیلئے جو مجاہدات اختیار کئے وہ کرتے نہیں۔ آج طالب علم جہاں آرام وعیش زیادہ ہو خواہ اسباق کمزور ہوں وہاں داخلہ کا

خواہشمند ہے۔

تعلیمی انحطاط کے اسباب:

انحطاط کے دو سبب ہیں ایک سبب تو یہی کہ مطمح نظر نصب العین علم کا مقصد بدل گیا۔ پہلے کچھ اور مقصد تھا آج کچھ اور ہے جب مقصد کار بدل جائے تو انداز سعی بھی بدل جاتا ہے۔

دوسرا سبب انحطاط کا یہ ہے جسکی وجہ سے علوم واستعداد میں بہت بڑا نقصان آیا کہ ہمارے درس نظامی کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس کا اردو میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔ میزان سے لیکر دورۂ حدیث تک سب کا اردو میں ترجمہ ہے۔ اس نے بنیادیں ہلا دی ہیں۔ طالب علم کہتا ہے کہ میں بھی اردو شرح دیکھ لونگا۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔ اساتذہ میں بھی یہ بات آگئی ہے کہ اردو کے تراجم وشروح دیکھتے ہیں۔ اس نے کم محنت اور ترک محنت کا عادی بنا دیا۔ عربی کی استعداد ختم ہوگئی۔ ہم نے جو دور دیکھا ہے آج دل اسکو یاد کر کے روتا ہے۔ اردو کی شروح وکتب کا تو رواج ہی نہ تھا۔ نہ کسی درسی کتاب کا ترجمہ دیکھا جاتا تھا۔ طلباء کو پابند بنایا جاتا تھا کہ حاشیہ سے کتاب حل کریں۔ بعض اساتذہ فرماتے تھے کہ کتاب کو بغیر حاشیہ کے پڑھو۔ محشّیٰ کتاب نہیں پڑھاتے تھے۔ عبارت کے سیاق وسباق سے حل کرو۔ آج یہ سب کہاں ہے۔ تو یہ دوسرا سبب ہے کہ انداز تدریس میں بہت بڑی تبدیلی آگئی۔ ایسے تراجم آگئے ہیں کہ مترجم کو کتاب فہمی کا سلیقہ بھی نہیں، کتنی اغلاط ہوتی ہیں۔ وہی غلطیاں اگر استاد بھی دیکھ لے اور طالب علم بھی تو آگے تک منتقل ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن کسی کو یہ پتہ نہیں کہ یہاں پر کہاں کہاں تسامحات ہوئے اس لئے کہ مدار ہی اردو ترجمہ پر ہے۔ مدار اردو ترجمہ پر رکھا تو مجھے بڑی معذرت کے ساتھ آپ حضرات سے یہ درخواست کرنی ہے کہ خدا کے لئے آپ اپنے مدارس سے اردو شرح اور اردو حواشی سے استفادہ کرنا بالکل ممنوع قرار دے دیں۔ خود بھی اس کی عادت ہے تو ترک کر دیں۔ طالب علم کے لئے یہ قابل سزا جرم قرار دیا جائے کہ اگر کوئی طالب علم اردو کی شرح یا اردو کا حاشیہ دیکھتا ہوا پایا گیا تو اس کو سزا دی جائے گی یہ جرم قرار دیا جائے۔

میرے نزدیک اس سے بڑی کوئی کوتاہی کی بات نہیں ہے کہ ایک شخص ہے اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ ہدایہ کی عبارت کو بغیر اردو ترجمہ کے سمجھ لے کیا آپ اس کو عالم کہیں گے؟ ہم نے تو اپنے

اساتذہ سے یہاں تک سنا تھا کہ پہلے زمانے میں عالم کی پہچان یہ تھی کہ جو ہدایہ کا ایک صفحہ پڑھ کر، عبارت صحیح پڑھ کر اس کا مطلب بتادے۔تو یہ دلیل تھی اس کے صاحب علم اور صاحب استعداد ہونے کی۔

یہ مشہور بات تھی کہ ہدایہ کا ایک صفحہ صحیح پڑھ کر اس کا مطلب بتادے تو یہ اس کے صاحب استعداد ہونے کی نشانی ہے اس کے اوپر ایک اضافہ یہ کرتا ہوں کہ ہدایہ کا ترجمہ اور ہدایہ کی عبارت کا مطلب بیان کرنا تو اپنی جگہ ہے میرے نزدیک اگر کوئی شخص تفسیر بیضاوی کا ایک صفحہ نہیں آدھا صفحہ تفسیر کا خالی ارتجالاً صحیح پڑھ کر بتلادے تو میں سمجھوں گا کہ یہ صاحب استعداد ہے۔لیکن یہ ساری باتیں جب ہونگی جب اردو کے ترجمہ کی حاجت نہ ہو اردو کے ترجموں سے مستغنی ہو کر بیضاوی پڑھی ہو، ہدایہ پڑھی ہو۔آج عبارت ہمیں پڑھنی نہیں آتی ایک سطر میں کئی کئی غلطیاں ہوتی ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ان چیزوں کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔

تو بات میں یہ کررہا تھا کہ جو اسباب ہمارے یہاں انحطاط اور استعداد کی کمزوری اور کوتاہی کے ہیں وہ میری نظر میں دو ہیں۔

(۱) مقصدِ علم نبوت تبدیل ہو گیا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا''جو شخص علم دین کو دنیا کے لئے حاصل کرے گا جنت کا رائحہ اس کو نصیب نہیں ہوگا''۔

(۲) حصول دنیا مقصود بن جائے علم نبوت کا، میراث نبوت کا تو اس سے بڑھ کر اور زیادہ بد نصیبی کیا ہوگی۔اس لئے طلباء پر سب سے پہلی محنت آپ حضرات کو یہ کرنی ہے کہ ان کو اپنا مقصدِ علم نبوت اور مقصد میراثِ نبوت ہر وقت مستحضر کروایا جائے۔ہم یہ علم دین کیوں پڑھ رہے ہیں؟ اس کا مقصود کیا ہے؟ کیا اس لئے پڑھ رہے ہیں کہ اس کی ڈگری سند لے کر آگے کالجوں، یونیورسٹیوں میں جا کر نوکریاں کریں گے، دنیاوی منصب حاصل کریں گے۔آپ ان کو ہر وقت اس کی تاکید کیجئے، عادی بنایئے کہ یہ مقصد پیشِ نظر رکھا جائے۔

دوسری بات یہ کہ ان کی استعداد کو ٹھوس بنانے کے لئے پختہ بنانے کے لئے تاکہ وہ جس فن کے اندر جو کتاب پڑھیں ان کی بنیاد مضبوط ہو ان پر محنت کی جائے۔محنت کا سب سے پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اُن کو اس کا عادی بنائیں کہ وہ کتاب کے حل کے لئے کسی اردو شرح یا اردو حاشیہ کی کبھی مدد نہ

لیں اور اسے قابلِ سزا جرم قرار دیں، داخلہ بند کردیں اردو کی کتابوں کے حواشی کا۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے اندازِ تدریس پر یقیناً غور وفکر فرمایا ہوگا۔

ہمارے مفتی صاحب قدس سرہٗ نوجوان اساتذہ کی طرف خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے کہ علم تو تم لوگوں کا تازہ ہے لیکن بال میرے سفید ہیں مطلب یہ ہوتا تھا کہ بھائی آپ کو علوم مستحضر ہیں اور ان علوم کے استحضار کا یقیناً آپ کو فائدہ پہنچ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک تجربہ بھی ہو جاتا ہے یاد بھی ہو جاتا ہے۔ آپ حضرات نے شرح عقائد میں پڑھا ہے کہ بعض ایسی چیزیں ہوتی ہیں کہ جو شیخوخت کے زمانہ میں کرنا آسان ہوتا ہے جوانی میں آدمی نہیں کر پاتا اس کی حکمت کیا ہے؟ حکمت یہ ہے کہ اس بوڑھے کو وہ کام کرتے کرتے عادت پڑ گئی تو اس کو کرنا آسان ہو گیا اور جوان کو اس کی عادت نہیں اس کو کرنا دوبھر اور مشکل ہو گیا تو بعض چیزیں عمر کے ساتھ ساتھ اور تجربہ کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتی ہیں اس لئے بہر حال فائدہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت آپ حضرات کی خدمت میں مع خراشی کی جارہی ہے کہ علم تو آپ کا تازہ اور مستحضر ہے۔

تو اس لئے آپ کو سب سے پہلے طلبہ کی بنیادی استعداد کے لئے یہ کوشش کرنی ہے کہ ان میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ نفس کتاب کو بغیر کسی اردو شرح وحاشیہ کے سمجھیں یہ استعداد پیدا ہو جائے مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ جو کتاب پڑھائیں اس پر نفس کتاب کو حل کرنے کی کوشش کریں لمبی چوڑی تقریریں بے محل نہ کریں۔

مجھے دار العلوم میں الحمد للہ ایک عرصہ دراز ہو گیا اللہ نے مجھ پر کرم فرمایا اپنے فضل سے خدمت کا موقع دیا دار العلوم میں میرا (۴۹) سال چل رہا ہے آدھی صدی میں ایک سال کم ہے تو بہت سے مراحل، حالات دیکھے۔

ابتدائی درجات کی کتب کی تدریس کا طریقہ:

ایک استاد کی درسگاہ میں نگرانی کے سلسلے میں حاضر ہوا وہ نحو میر پڑھا رہے تھے۔ نحو میر ایک ابتدائی کتاب ہے۔ وہاں جماعت میں جب حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ طلبہ بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں میں استاد کے برابر میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کیا لکھا جا رہا ہے طلبہ سے پوچھا کیا لکھ رہے ہو طلبہ نے کہا

کہ جی استاد کی تقریر لکھ رہے ہیں میں نے کہا کہ نحو میر میں تقریر؟ کہا کہ جی استاد لکھوا رہے ہیں میں نے کہا کہ کیا لکھا سناؤ تو معلوم ہوا کہ دو دن سے بسم اللہ کے اوپر تقریر چل رہی ہے استاد طالب علموں کو لکھوا رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے اسی وقت طلبہ سے کہا کہ بند کرو کاپی آئندہ کوئی تقریر نہیں لکھی جائے گی پھر استاد کی میں نے تھوڑی سی اچھی تادیب کی اور ان کو بتلایا کہ اگر شوق پورا کرنا ہے تو آپ اس کے لئے کسی اور جماعت کا انتخاب کیجئے یہ تقریر بے محل ہے ان بچوں کو بسم اللہ کا ترجمہ نہیں آتا۔ آپ ان سے کتاب پڑھوائیں اور پڑھائیں پابندی لگوادی کہ کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں بس ان کو نفس کتاب، اس کا ترجمہ آجائے مطلبِ کتاب آجائے لمبی چوڑی تقریر نہیں۔

آج ہمارے یہاں بیماری یہ ہے کہ استاد اپنی قابلیت کو ظاہر کرنے کے لئے طلبہ پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے یا ان کو مانوس کرنے کے لئے لمبی چوڑی بے محل باتیں شروع کردیتے ہیں۔ سب نہیں بعض ناتجربہ کار استاد ایسے ہوتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ انھوں نے اپنے علم کا مظاہرہ کیا آگے طالب علم بے چارہ الجھن میں مبتلا ہے اسے کچھ معلوم نہیں کہ میرا استاد کیا کہہ رہا ہے کہاں جارہا ہے اس لئے کہ اس میں استعداد ہی نہیں اس بات کی "کلموا الناس علی قدر عقولهم" بات کرو عقل کے مطابق کرو جس میں جتنی صلاحیت ہے اس کے مطابق کرو ابتدائی سال میں ان کو اس درجہ کے مطابق نفس کتاب سمجھاؤ اس سے اوپر کے طلبہ ہیں ان کو تھوڑا سا مشکل سا کچھ اضافی چیزیں بتلاؤ اوپر کی جماعتوں میں جا کر البتہ تقریر وہاں پر بھی نہ ہونا چاہیے مدارس کے اندر لمبی چوڑی تقریروں کا رواج پڑ گیا ہے آخر دور میں جا کر بنیادی بات طالب علم کی کتاب سمجھنے کی یہ ہے کہ وہ استاد کی لمبی چوڑی تقریروں میں کھو جاتا ہے اور اس کو کتاب کا نفس عبارت کا مطلب ہی نہیں آتا عبارت کا حل معلوم نہیں لمبی چوڑی تقریر میں گم ہوجاتا ہے اور وہ سمجھتا نہیں کہ میں نے کیا حاصل کیا کیا اس کا مجھے فائدہ ہے۔ اس کو بالکل یکسر ختم کردیجئے کوئی تقریر نہیں صرف نفس کتاب ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ طلبہ کی استعداد بنانے کے لئے، ابتدائی استعداد کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ جو کچھ پڑھائیں اس کا اجرا بھی ساتھ کے ساتھ کروائیں۔ اگر آپ نے اجرا نہ کروایا تو اس صورت میں جو کچھ چیزیں اس نے سیکھی ہیں وہ قابلِ استعمال نہیں ہونگی اور جب وہ

قابل استعمال نہیں ہوں گی تو مستحضر نہیں رہیں گی ختم ہو جائیں گی۔

ہمارے یہاں عام طریقے کے اور نحو کی کتاب کے اندر بہت فرق ہے اساتذہ محنت کرتے ہیں لیکن ایک چیز کی میں کمی محسوس کرتا ہوں کہ ترکیب کا فقدان ہے۔ اساتذہ عام طریقے کے اوپر کوئی مثالیں یا جملے لے آئیں۔ ھدایۃ النحو ہے مثلاً اس میں بہت سی مثالیں آتی ہیں۔ اشعار آتے ہیں کافیہ کے اندر اسی طریقے سے۔ ترکیب نحوی انتہائی ضروری ہے آپ اگر ترکیب نحوی نہیں کروائیں گے تو یاد رکھیں طالب علم کی کبھی استعداد پختہ نہیں ہوگی صرفی اعتبار سے بھی انکا اجرا تو ہے لیکن نحوی ترکیب ضروری ہے۔ مدارس میں اس کا رواج ڈالیے۔ آپ اپنے طلبہ کے اوپر محنت کیجئے اور ایک بات جو میں عرض کیا کرتا ہوں وہ یہ کہ ہمارے یہاں اوپر کے درجات میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ کتابیں استاد پڑھاتے وقت جسے ہماری اصطلاح میں کہتے ہیں لکیر کا فقیر بس مکھی پر مکھی اگر کتاب کے اندر ایک مثال لکھی ہوئی ہے تو وہ اسی پر اکتفاء کرتا ہے دوسری مثال نہیں دیتا۔ نہیں! آپ اُس جگہ پر جہاں کسی فن کی بات کہی جارہی ہے کوئی قاعدہ کوئی اصول یا ضابطہ بیان کیا جارہا ہے اس کی دو چار مثالیں دے کر اس قاعدہ کی مشق کرایئے اجرا کرائیے ورنہ وہ قاعدہ مستحضر نہیں ہوگا یہ بنیادی چیزیں ہیں جو نحو صرف کی کتابوں کے اندر خاص طریقے سے ہوں تو آگے چل کر کام آئیں گی۔

اساتذہ وذرائعِ علم کا احترام:

ایک بات ضمناً عرض کر کے جو اپنا اصل مقصد ہے جو اس وقت مجھ سے متعلق موضوع ہے وہ عرض کروں گا کہ علومِ نبوت اور میراثِ نبوت حقیقت یہ ہے اور یہ بات میں بلاریب کہتا ہوں اور اگر قسم کھا کر کہوں تو حانث نہیں ہوں گا انشاء اللہ۔ اس علم کا تعلق علمِ دین کا تعلق جن اساتذہ سے ہے، جن کتابوں سے ہے اور اُن کے واسطے سے جن جن اکابر سے ہے اور اوپر جہاں جہاں ان کا تعلق منتہی ہوتا ہے جب تک ان کا ادب واحترام اور عظمت دل کے اندر نہیں ہوتی کبھی یہ علم نہیں آئے گا کبھی نہیں۔ علم عین ادب ہے علمِ دین عینِ ادب ہے ہم نے اس عرصہ میں ایسے نظائر دیکھے کہ آپ حیران رہ جائیں۔

ایک ایسا طالب کہ جس کو اپنی ذہانت پر خود بھی گھمنڈ تھا اور پورا مدرسہ اس کی ذہانت اور ذکاوت اور قوت حافظہ کا گواہ تھا۔ ایک بات جو اس نے ایک مرتبہ ایک ترچھی نگاہ سے دیکھ لی یا اس کے کان میں

پڑ گئی تو ایسے جس طرح نقش علی الحجر یعنی پتھر کی لکیر لیکن بد نصیبی کی بات یہ تھی کہ اساتذہ کے حق میں بے ادب تھا غرور، گھمنڈ نے اس کو اس طرح گمراہ کیا کہ اساتذہ کے ادب کے اندر کوتاہ۔ اس سے تمام اساتذہ کو بڑی توقعات تھی اس نے مجھ سے کئی کتابیں پڑھی ہیں اس کو مجھ سے خاص تعلق بھی تھا۔ علوم کی کتابیں اس نے مجھ سے پڑھی تھیں کافی عرصہ بعد مجھ سے ملنے آیا تو اس کا حال یہ تھا کہ میں اس کو پہچان بھی نہیں سکا، ڈاڑھی منڈھی ہوئی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی جنگل کا چرواہا، بکریوں کے چرانے والا لیکن اس کی آواز سے میں نے اس کو پہچانا کہ وہ فلاں ہے کہا جی! میں نے کہا تیرا یہ حال کیا ہوا؟ تو وہ بڑا نادم شرمندہ ہوا کہنے لگا مجھے آپ کے پاس آتے ہوئے ڈر بھی لگ رہا تھا حیا بھی آرہی تھی لیکن بغیر ملے ہوئے آپ سے میرا جانے کو دل نہیں چاہتا تھا مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے ڈانٹیں گے تنبیہ کریں گے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ میں آئندہ آؤں گا تو میری صورت بدلی ہوئی ہوگی میں نے کہا کہ خدا تجھے ہدایت کی توفیق دے۔

بے ادبی کے نتیجہ میں یہ ہوا یہ ایک نہیں اس وقت میرے سامنے کئی مثالیں ہیں کتابیں ادوات علم ہیں اساتذہ ذریعہ ہیں اور یاد رکھئے کہ جس طرح منعم کا حق ہوتا ہے اسی طریقے سے ذریعہ کا بھی حق ہوتا ہے آپ حضرات تو اساتذہ کرام ہیں آپ سے میں کیا عرض کروں کتابوں کے خطبے کے اندر ابتداء میں ہم سب سے پہلے الحمد للہ رب العالمین پڑھتے ہیں اور اس کے بعد والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء محمد و آلہ و اصحابہ یہ لکھا ہوا ہوتا ہے یا اسی قسم کی عبارت ہوتی ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد محمد ﷺ پر درود بھیجنے کا رواج اور حکم ہے۔ اس کی حکمت آپ حضرات جانتے ہیں اور شرح بیضاوی وغیرہ میں اس کی تشریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ پر اگر اللہ کی حمد و ثناء کے بعد کوئی شخص درود نہ بھیجے اللہ کی حمد کرے لیکن نبی پر صلاۃ و سلام نہ بھیجے تو اس نے حق منعم ادا نہیں کیا اس لئے کہ منعم حقیقی تو اللہ ہے لیکن اس منعم حقیقی کا انعام پہنچانے کا ذریعہ تو محمد ﷺ ہی بنے تو اللہ کی تعریف کر لی اور واسطہ کو چھوڑ دیا۔ ہم نے آپ ﷺ کے لئے دعا تک بھی نہیں کی تو ہم نے منعم کا حق نہیں پہنچایا اور حضور ﷺ واسطہ ہیں اور واسطہ کی قسمیں آپ حضرات نے پڑھی ہیں کہ واسطے کون کون سے ہیں۔

واسطہ بالاثبات، واسطہ باالثبوت، واسطہ بالغرور، یہ تین قسمیں واسطہ کی مسلّم اور شرح مسلّم

کے اندر لکھی ہوئی ہیں تو واسطہ کا حق اسی طریقہ سے ہوتا ہے جیسا کہ ذوالواسطہ کا "وقضی ربك الاتعبدوا الا اياه وبالوالدين احسانا" اللہ نے والدین کا ذکر اپنے ساتھ ساتھ کیا عبادت صرف اللہ کی لیکن والدین کا مقام ذکر کیا وبالوالدین احسانا کہ ان کو بھی بھولنا نہیں کیونکہ تمہارے وجود کا خالق اللہ ہے لیکن ذریعہ تمہارے والدین ہیں۔ تو اس لئے حضور ﷺ کے اوپر درود شریف ان کا حق ہے۔ اب یہ کتابیں ہیں، یہ اساتذہ ہیں یہ تمام ذرائع ہیں اگر کوئی طالب علم ان کا حق ادا نہیں کرتا، اساتذہ کی شان میں بے ادبی کرتا ہے، گستاخی کرتا ہے، کتابوں کی بے حرمتی کرتا ہے تو یاد رکھئے کبھی اس کو علم نہیں حاصل ہو سکتا آج مدارس میں یہ بات بالکل مفقود ہو گئی ہے کہ ہمارے یہاں روک ٹوک کا رواج نہیں رہا میں معذرت کے ساتھ حضرات منتظمین مدارس سے بھی اور اساتذہ کرام سے یہ عرض کرتا ہوں کہ آج ہمارے یہاں یہ خیال گزرتا ہے کہ ہم نے اس طالب علم کے اوپر کچھ روک ٹوک کی تو یہ بھاگ جائے گا چھوٹے مدارس میں عام طور پر یہ خطرات زیادہ ہوتے ہیں تعداد کی کمی کی وجہ سے مجھے یاد ہے اپنے بچپن کا دور کہ جہاں جلال آباد میں میں نے ہندوستان کے اندر ابتدائی تعلیم حاصل کی وہاں روک ٹوک کا یہ حال تھا کہ ہر استاد ہر طالب علم کے بارے میں فکرمند ہوتا تھا کہ اس سے کوئی بات خلاف ادب تو سرزد نہیں ہوئی۔

ایک موٹی سی مثال اس کی میں عرض کرتا ہوں صف کے اندر مسجد میں جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو ظاہر ہے جماعت میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا استاد کے برابر شاگرد کھڑا ہے، آقا کے برابر غلام کھڑا ہوا ہے، طریقہ ایک ہی مسنون ہے۔ لیکن ادھر سلام پھیرا اور جماعت کے بعد فوراً وہ طالب علم جو استاد کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا وہ وہاں سے سرک جاتا ہے پیچھے ہٹ جاتا ہے یا یہ کہ وہ ایک طرف چلا جاتا ہے استاد سے لگ کے پھنس کر نہیں بیٹھتا اس لئے کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کوئی طالب علم سنن یا نوافل استاد کے سامنے کھڑے ہو کر نہیں پڑھتا کہ استاد میرے پیچھے اور میں اس کے آگے کھڑا ہوں کوئی طالب علم استاد کے بالکل پیچھے کھڑے ہو کر نوافل نہیں پڑھتا کہ استاد نماز سے فارغ ہو کر جائے تو میں اس کا راستہ روک رہا ہوں بالکل پیچھے کھڑا ہوا ہوں، استاد کے بالکل آگے یا پیچھے نماز پڑھنا بے ادبی میں شمار ہوتا ہے میں نہیں کہتا کہ کوئی حرام کام ہے بلکہ میں ادب کی باتیں بتا رہا ہوں۔

کسی استاد کے ساتھ کوئی طالب علم جا رہا ہے تو کوئی اس کی جرأت نہیں کرتا تھا کہ آگے آگے چلے

یہاں بھی شروع زمانے میں ہم نے دیکھا کہ اگر کوئی طالب علم اپنے استاد کو چلتے ہوئے دیکھتے تو رک جاتے ٹھہر جاتے۔ سبق کے اندر اساتذہ کا احترام، درس گاہ میں احترام، بازار میں احترام، باہر احترام، آج یہ ساری چیزیں گم نظر آتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ عظمت اُٹھ گئی دلوں سے اساتذہ کی اور اساتذہ کے دلوں سے طلبہ کی شفقت ختم ہوگئی۔ یہ دونوں طرف سے ہے اساتذہ کے دلوں میں جو طلبہ کی شفقت تھی شفقت کا تقاضہ کیا ہے؟ روک ٹوک ہے آپ غلطی دیکھیں طالب علم کو روکیں۔ کسی گناہ میں مبتلا دیکھیں تنبیہ کریں آج ہم نے یہ کام چھوڑ رکھا ہے غرض یہ کہ ان ساری چیزوں سے علم کا نور ختم ہوگیا، استعدادیں کمزور ہوگئیں، مقاصدِ علم نبوت ہمارے اوجھل ہوگئے، ان کی آپ فکر کیجئے خدا کے لئے، ورنہ ان درس گاہوں کا جو مقصود ہے وہ پورا نہیں ہے بلکہ یہاں علوم نبوت کا پروان چڑھانا علوم نبوت سے آگے امت کو فائدہ پہنچانا وہاں آگے میراث نبوت کی نشر واشاعت تبلیغ کی شکل میں، تدریس کی شکل میں، تقریر کی شکل میں، یہ مقصود ہے علم کا جو آج ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔

علم تفسیر کی تدریس ابتدائی درجات میں:

میرے عزیزو! بہت سی باتیں ہیں جو دل میں ہیں اور جن کے لئے لمبا وقت چاہئے اس وقت میں آپ کی خدمت میں مجھ سے متعلق جو موضوع ہے وہ علم تفسیر ہے کہ اس کو پڑھانے کے لئے کیا چیزیں بنیادی طور پر ہونی چاہئیں بالخصوص ابتدائی درجات میں اور انتہائی درجات میں۔

پہلے آپ یہ سمجھ لیجئے کہ علم تفسیر کا مقصد اصل میں کوئی ایک چیز یا کسی ایک فن کو سیکھنا نہیں بلکہ علم تفسیر یا قرآن کی تفسیر یہ درحقیقت جب حاصل ہوتی ہے جب کہ آدمی کو متعدد علوم اور اس کے متعدد مبادی پر عبور اور مہارت ہو آپ حضرات اگر بیضاوی پڑھاتے ہیں یا پڑھی ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قاضی بیضاوی تفسیر بیضاوی کے اندر تقریباً گیارہ علوم کے اندر بحث کرتے ہوئے چلتے ہیں گیارہ علوم سے بحث کرتے ہوئے جاتے ہیں یہ علوم تفسیر ہیں لیکن وہ گیارہ علوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کے سیاق کے اندر اس کے بغیر تفسیر مکمل نہیں اس لئے علم تفسیر کو پڑھانے کے لئے ان تمام چیزوں کو مستحضر کرلیں اور طالبعلم کو ان چیزوں کا خوگر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ بتدریج ان مراحل سے گزارا جائے۔ ایک دم آپ سارے علوم سمجھانا چاہتے ہیں تو یہ دشوار ہوگا، بتدریج

یعنی نچلے درجات سے یہ کام شروع کریں اور آخر کے درجات میں جب پہنچیں تو ان سارے علوم کا قرآن کی نسبت سے تعارف حاصل ہو چکا ہو۔

مثلاً ہمارے یہاں درجہ ثانیہ میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھایا جاتا ہے ایک بات تو میں آپ حضرات سے عرض کرونگا کہ اللہ کیلئے آپ یہ عنوان تبدیل کر دیجئے۔

اس دفعہ وفاق المدارس کا اجلاس ہوا میں خود تو حاضر نہ ہوسکا لیکن کچھ تجاویز بھیجیں ان میں یہ تجویز بھی بھیجی کہ آپ ابتدائی درجات کے اندر تفسیر قرآن کریم کا عنوان مت رکھیں ابتدائی درجات ثانیہ، ثالثہ، رابعہ، خامسہ کے اندر ترجمہ قرآن کا عنوان دیں۔

تفسیر کا نہیں یہ بہت بڑی غلطی ہے، بہت بڑے نقصان کا سبب ہے۔ وجہ کیا ہے؟ وجہ اسکی یہ ہے کہ درجہ ثانیہ میں جو طالب علم پہلی مرتبہ قرآن کریم کے پارے پڑھ رہا ہے ظاہر ہے کہ اسے اس درجے میں مفسر بنانا مقصود نہیں ہے۔ بے شمار تفسیری نکات مفسرین کے اقوال، واقعات، شان نزول کی قسمیں اور طرح طرح کے تفسیری مباحث وہ درجہ ثانیہ کے طلباء کے سامنے بیان کر رہا ہے اور طالب علم کا حال کیا ہے کہ اس سے قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ پوچھو تو اسے لفظی ترجمہ نہیں آتا تو یہ بہت بڑی خطا ہے اور کوتاہی ہے کہ ہم نے اس درجے میں تفسیر کا نام رکھ دیا۔ خدا کیلئے آپ ان درجات کے اندر اسکا نام ترجمہ قرآن رکھیں اور یہ ہی عنوان استعمال کریں اور اس میں اتنا اضافہ کر لیں کہ لفظی ترجمہ قرآن مع مختصر تشریحات بالکل یہ بھی نہیں کہ آپ نے خالی ترجمہ کر دیا اسے سیاق وسباق سے کچھ........ مثلاً علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی اگر اسکا حاصل بھی آپ طالب علم کو بتادیں گے تو اس درجے میں اس کیلئے کافی ہوگا۔ آپ اس درجے میں تفسیر قرطبی دیکھ آئیں اور تفسیر روح المعانی دیکھ آئیں اور اسکے سامنے بیان کریں تو اپنا وقت بھی ضائع کر رہے ہیں اور اسے بھی برباد کر رہے ہیں۔ اسلئے عنوان تبدیل کر دیجئے۔ عنوان یہ ہو کہ ''لفظی ترجمہ قرآن مع ضروری تشریحات'' یہ درجہ ثانیہ میں ہو اور ثالثہ، رابعہ، خامسہ میں بھی اسلئے کہ ہمارے یہاں (آپکے یہاں معلوم نہیں) دس دس پارے تین درجات میں ہیں۔ جن درجات میں دس دس پارے ہیں وہاں ترجمہ ہو اصل مقصود بھی یہی ہے۔ آپ خود اپنے قلوب میں غور فرمائیں آپکا مقصد یہاں طالب علم کو لفظی ترجمہ سکھانا ہے اگر سارے مباحث بالفرض اسکو پڑھا

دیئے، بالفرض اگران میں کوئی ذی استعداد ہےاوروہ ان باتوں کو یاد بھی رکھ لےلیکن اسے لفظی ترجمہ نہیں آتا تو آپکا مقصود حاصل نہیں ہوگا۔اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ اوراسکے ساتھ ساتھ ضروری فوائداورتشریحات ہوجائیں تو بہت ہے۔

ایک بات تو یہ ہوئی دوسری بات یہ ہے کہ ترجمہ قرآن جو آپ پڑھارہے ہیں درجہ ثانیہ اور ثالثہ میں دس دس پارے پڑھارہے ہیں ۔اس میں آپ بنیادی ترجمہ اور لفظی وٹکسالی ترجمہ کا اہتمام کریں۔ لفظی ترجمہ ہوطالب علم کو معلوم ہوکہ لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اکابر کی قبور کو منور فرمائے۔حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا جواردوترجمہ ہے آج تو اس کے سمجھنے والے بہت کم ہیں۔شاہ صاحبؒ کا موضح القرآن اوروہ ترجمہ جو چھپا ہوا ہے وہ ایسی ٹکسالی دِلّی کی اردو ہے کہ اسکا سمجھنے والا بہت کم ملے گا۔ الطیبات للطیبین ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے اب اسکا ترجمہ کہ ستھری کسے کہتے ہیں۔ الخبیثت للخبیثین گندیاں ہیں گندوں کے واسطے اتنا پیارا، اتنالذیذ اتنا جامع اور مختصر ترجمہ۔ الطیبات کا ستھری سے بہتر ترجمہ کوئی نہیں ہوسکتا تو اگر آپ اسکی اردو سمجھ سکتے ہیں تو اسی کو دیکھ لیا کریں۔اس میں لغوی ترجمہ ایسا ٹکسالی ترجمہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس لغت کا اردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ نہیں ہوسکتا تو اسکا اہتمام کیجئے کہ لغوی ترجمہ آئے لغت میں اسکے کیا معنی ہیں اور عبارت میں اس لفظ کے معنی کو کس طرح پرویا گیا اور سمویا گیا ہے۔

ایک بات ترجمے کے ذیل میں یہ ہے کہ (میں ترجمے کا عنوان اختیار کررہا ہوں تفسیر کا نہیں) لغات کے معنی کے ساتھ ساتھ صیغوں کا اہتمام کیجئے۔قرآن کریم میں جو صرفی صیغے استعمال کئے ہیں۔ آپ طالب علم سے پوچھیں یہ کس باب سے ہے، کس وزن پر ہے، کونسا صیغہ ہے، اشتقاق کیا ہے، قرآن کریم سے زیادہ بہتر کتاب ادب، صرف اور نحو کی تمرین کیلئے اور کوئی نہیں مل سکتی اگر قرآن کریم میں کوئی شخص تمرین کرادے فن صرف واشتقاق کی، فن نحو کی، ادب کی تو اسکو دوسری کتاب پڑھنے کی حاجت بہت کم پیش آئے گی۔

ہمارے استاد حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحب قدس اللہ سرہ میں نے حدیث ان سے پڑھی۔اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔انہوں نے مقامات حریری کا حاشیہ لکھا ہے۔ادب کی کتاب

ہے آپ اس حاشیہ کو دیکھیں تو جتنے مقامات حریری کے لغات ہیں ان سب کے مأ خذ اور مبداء اشتقاق سب قرآن مجید سے حاشیہ میں لکھے ہیں۔قرآن کریم سے انکے مأ خذ کا ذخیرہ جمع کیا۔یہ لفظ قرآن کریم کے اندر آیا ہے اور فلاں فلاں جگہ آیا ہے۔یہ مادہ ہے یہ معنی ہے۔اور اتنے معانی میں استعمال ہوا ہے۔معلوم یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مقامات حریری کے اس حاشیہ کو پڑھ لے تو اسے قرآن کریم کے مآخذ کی اتنی معرفت ہو جائیگی کہ ادب بھی آئے گا اور قرآن بھی آئے گا تو میں یہ کہا کرتا ہوں کہ قران کریم ایسی کتاب ہے کہ اسکے اندر اللہ تعالی نے تمام علوم کو اس طریقہ سے سمو دیا ہے۔اس بناء پر مفسرین نے مفسر کیلئے جو شرائط رکھی ہیں اسکے اندر یہ ہے کہ اسکو علم لغت، علم نحو، علم اشتقاق، علم حدیث، علم معانی، بیان اور بلاغت پر عبور ہو۔تقریباً پندرہ علوم کی شرائط مفسر کیلئے لکھی ہیں تب جا کر مفسر بنتا ہے۔اسلئے کہ آپکو قرآن کریم میں یہ سارے علوم نظر آئیں گے۔عجیب وغریب کتاب ہے۔

اور میں تو اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہمارے سامنے محفوظ ہیں یہ اللہ کا کرم ہے اگر یہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کا ذخیرہ ہمارے سامنے نہ ہوتا تو آج ہمارے لئے پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ لغت عربیہ حضور ﷺ کے زمانے میں کس شکل میں تھی۔

آج اہل عرب، اہل حجاز، مصر و یمن جو عربی بولتے ہیں ہم تو اسے نہیں سمجھتے ۔ الا یہ کہ جو وہاں رہے اسلئے کہ کتاب سے اسکا کوئی تعلق نہیں۔وہ محلی اور عصری زبان ہے۔قرآن وسنت سے اسکا کوئی تعلق نہیں، قرآن وسنت نے ہمیں یہ بتایا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں زبان عربی یہ تھی۔آج جو مصر و حجاز میں بولی جاتی ہے یہ نہیں تھی۔

اگر قرآن نہ ہوتا تو ہم عربی کے تشخص کو پہچان نہ سکتے ۔قرآن کے ذریعہ لغت محفوظ ہوگئی، بلاغت کے اصول محفوظ ہو گئے ۔

ایاك نعبد و ایاك نستعین یہاں آپ حضرات نے پڑھا ہے کہ کلام کے اندر التفات ہے۔ **الحمد لله رب العالمین ○ الرحمن الرحیم ○ مالك یوم الدین** ۔یہ تمام غائب کے صیغے آرہے ہیں، اسم ظاہر غائب کے حکم میں ہوتا ہے۔**ایاك نعبد** میں خطاب آگیا۔اب تک تو **الرحمن الرحیم مالك یوم الدین** سیاق غیبت تھا۔غائب کے صیغوں کا سیاق تھا **ایاك نعبد** میں خطاب کا

سیاق کیسے شروع ہوگیا۔ تو اسکو آپ حضرات کب سمجھیں گے اور کس طرح سمجھائیں گے۔ جبکہ آپ نے مختصر المعانی پڑھی ہوگی۔ بلاغت سے آپ واقف ہونگے۔ اصطلاح بلاغت میں اسکو التفات کہا جاتا ہے تو التفات من صنف الی صنف یہ بلاغت کا ایک حسن ہے اگر ایک ہی انداز سے کلام ہوتا رہے تو سننے والا بھی اکتا جائے گا۔ اسکے اندر وہ لذت باقی نہیں رہے گی۔ تنوع اگر ہوگا تو سننے والے کو اس میں لطافت اور لذت محسوس ہوگی۔ تو اسلئے قرآن کریم میں التفاتات بھی ہیں۔

بیت:

تطاول لیلك بالاثمد .... ونام .... ولم ترقد .

یہاں پر کلام میں التفات ہے۔ آپ حضرات اہل علم ہیں میں آپ کو کیا بتلاؤں تو ضروری ہے کہ علم بلاغت کی معرفت ہو اسکے بعد آپ قرآن سمجھیں گے۔ لیکن یہ مرحلہ اخیر میں آئے گا۔ ابھی تو میں درجہ ثانیہ ثالثہ کی بات کر رہا ہوں۔

درجہ ثانیہ ثالثہ میں آپکو دوسری بات یہ کرنی ہے حل لغات کے بعد کہ آپ اس میں نحو اور صرف کے صیغوں اور ترکیب کا اہتمام کریں۔ اسکو آیات کی، ہر آیت کی نہیں، جو ترکیب کے لحاظ سے پیچیدہ ہیں کوئی ابہام و اشکال ہو اسکی ترکیب ہونی چاہئے۔ صیغے آئیں ان کے اشتقاق اس میں ہونے چاہئیں۔

بس اتنا کام آپ نے کرنا ہے ترجمہ قرآن مجید برائے درجہ ثانیہ و ثالثہ لفظی ترجمہ آئے، لغات کے معانی آئیں، اسکے ساتھ صرفی اشتقاقات نحوی ترکیب، خاص طور سے عم سپارہ میں ہمارے طلباء سے لغات پوچھیں انہیں لغات بہت کم یاد ہونگی۔ وہ بالکل ابتدائی درجہ میں پڑھایا جاتا ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ وہاں تفسیر بیان کردی لیکن وہاں حل لغات نہیں ہوا۔ آپ نے اسکے صیغوں کا اور ترکیب کا اہتمام نہیں کیا۔ اس پر آپ خدا کیلئے زور دیجئے اسکا اہتمام کیجئے۔ اور اس سے زائد کوئی تفسیری مباحث نہ بیان کیجئے۔ بس اسکا مفہوم مختصری تشریح کے ساتھ ثانیہ میں بھی اسی طرح ثالثہ میں بھی اسی طریقہ سے پھر رابعہ، قرآن کریم کے دس دس پارے آپ کے یہاں ہیں تو اس طریقہ سے پورے ہوجائینگے۔ انشاءاللہ۔

علم تفسیر کی تدریس انتہائی درجات میں:

اب آتا ہے درجہ یا قاعدہ فن تفسیر کا۔ دیکھئے ان درجات میں قرآن کریم کا جو ترجمہ ہے ثانیہ ثالثہ میں اسکا ایک مقصود تو یہ ہے کہ قرآن کریم کا لفظی ترجمہ آئے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ قرآن نحو اور صرف کے اعتبار سے جب آپ پڑھیں گے ان کے قواعد کے اجرا کے ساتھ تو نحوی قواعد کا بھی آپ کو استحضار ہوگا۔ ادب کا، لغات اور الفاظ کا بھی استحضار ہوگا۔ تو گویا کہ پھر قرآن کا ترجمہ ہی نہیں آیا بلکہ نحوی ضوابط وقوانین بھی پختہ ہوئے، صرفی قواعد بھی پختہ ہوئے اور اسکے ساتھ ساتھ ادب کے تقاضے بھی پورے ہوئے۔ ادبی لحاظ سے قرآن کریم میں دیکھئے۔ یہ تینوں چیزیں تابع ہیں لیکن ذریعہ ہیں قرآن کریم کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کا۔ ترجمہ آپ کرلیں لیکن نحو کے قواعد کا اجرا آپ نہ کریں۔ بات نامکمل رہے گی۔ ترجمہ آپ مکمل کر ہی نہیں سکتے۔ جب تک کہ آپ نحوی قواعد کا اجرانہ کرلیں۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ یہ فاعل ہے، مفعول ہے، حال ہے، ذوالحال ہے تمیز ہے، وہ ترجمہ کیا کریگا۔ جب تک آپ اسے یہ نہ بتلائیں کہ یہ حال ہے یا تمیز ہے کونسا مفعول ہے ترجمہ صحیح نہیں کرسکتا۔ اسلئے ان قواعد کا اجرا معین بنے گا قرآن کے صحیح ترجمہ کے واسطے۔

اب اگلا درجہ آیا سادسہ کا جہاں ہمارے یہاں تفسیر جلالین باعتبار تفسیر کے پڑھائی جاتی ہے۔ اُن درجات میں میں نے عرض کیا کہ تفسیر کا عنوان نہ رکھیں اور اُن درجات کی مثال ایسے سمجھ لیجئے جیسے کہ ہمارے یہاں درجہ ثانیہ میں زادالطالبین پڑھاتے ہیں اور درجہ رابعہ میں ریاض الصالحین پڑھاتے ہیں۔ اب زادالطالبین اور ریاض الصالحین میں حدیثیں ہی ہیں اور درجہ ثانیہ میں آپ وہ پڑھارہے ہیں تو یہاں زادالطالبین پڑھانے سے آپکا مقصود کیا ہے۔ یہاں مقصود اسکو محدث بنانا تو ہے نہیں۔ زادالطالبین کی ایک حدیث **المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده** اگر وہ پڑھتا ہے اب آپ اس میں مشکوٰۃ کی اور صحاح ستہ کی اگر تقریر کرنے بیٹھ جائیں اسکے سامنے تو بتلایئے کہ یہ کوئی محل ہوگا اس کا؟ یہاں مقصود محدث بنانا تو نہیں اسے۔ یہاں اسکے دو مقصود ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اسکو حضور ﷺ کے مختصر مختصر جوامع الکلم یاد کرالئے جائیں، استحضار ہوجائے ابتدائی درجہ میں چھوٹی چھوٹی حدیثیں ہیں مختصر مختصر جملے ہیں یہ یاد ہوجائیں گے۔ اسکو آگے کام آئیں گے، اسکے معارف وحقائق

آگے سمجھے گا۔

دوسرا مقصود اسکا یہ ہے کہ ان ہی احادیث میں آپ اجرا کرائیں کہ یہاں اس جگہ میں مبتدا کون ہے۔ خبر کون ہے ذوالحال کون اور حال کون ہے۔ نحوی اجرا اور صرف کے اشتقاقات، مبادی، مآخذ ان کا اجرا کرانا مقصود ہے ادبی لغات بھی اسکو معلوم ہونگے۔ لیکن نحوی صرفی اجرا اصل مقصود ہے زادالطالبین کا، مقصود محدث بنانا نہیں ہے۔ اب ایک استاد زادالطالبین پڑھادیتا ہے ترجمہ کردیتا ہے ایک حدیث کا اور لمبی چوڑی تفصیلی مباحث بیان کردیتا ہے۔ اس نے زادالطالبین کا حق ادا نہیں کیا۔ اسے چاہئے کہ اسکی مختصر حدیثیں طالب علم کو یاد کرادے اور نحوی ترکیب کا اجرا کرادے مبتدا ہے، خبر ہے، جملہ انشائیہ ہے، خبریہ ہے اسکے بغیر اسکا حق ادا نہیں ہوگا۔ یہی بعینہٖ ریاض الصالحین کے اندر ہے۔ ریاض الصالحین کے اندر بھی محدث بنانا مقصود نہیں ہے۔ وہاں حضور ﷺ کے ارشادات سے مقصود معاشرت اور معاملات کی تربیت کرنا ہے۔ مثلاً ریاض الصالحین کا باب الادب پڑھاتے ہیں۔ تو باب الادب کے اندر اسکو کیا بتلانا ہے نحوی صرفی تو وہ سیکھ کر آچکا ہے اور ابتدائی درجہ میں اجرا کر چکا ہے۔ اب بیان اس سے مقصود اس حدیث کے اندر آپ ﷺ کے آداب معاشرت کیا ہیں وہ بیان کرنا ہے حضور ﷺ کے معاملات کا طریقہ کیا تھا۔ لمبی چوڑی بحثیں مقصود نہیں۔ بس اس پر آپ معمولی سی تفصیل کے ساتھ اسکو وہ حدیث پڑھادیں اسکے بعد صحاح ستہ پڑھے گا اسکے مباحث آجائیں گے۔ اب جو حیثیت زادالطالبین اور ریاض الصالحین اور ان کے پڑھانے کے مقاصد ہیں وہی مقصد ابتدائی درجات میں قرآن کریم کے ترجمہ پڑھانے کا ہے۔ وہاں لفظی ترجمہ ہو اور نحوی صرفی قواعد کا اجرا ہو۔

اب آیا ہے درجہ باقاعدہ تفسیر کا چھٹے درجہ میں ہمارے یہاں جلالین پڑھائی جاتی ہے، ساتویں درجہ کے اندر بیضاوی پڑھاتے ہیں، یہ درجات وہ ہیں کہ ان میں طالب علم ذہنی اعتبار سے بھی مضبوط ہوجاتا ہے۔ استعداد میں بھی اسکی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور مختلف علوم کے مسائل وقواعد بھی اسے مستحضر ہوجاتے ہیں۔ اب یہاں اسکے لئے قرآن کی تفسیر تفسیر ہونے کی حیثیت سے پڑھنے کے اندر سہولت ہوتی ہے لہٰذا ان سارے علوم کی روشنی کے اندر جب جلالین پڑھتا ہے تو جلالین کے اندر ہمارے مدارس میں ایک طرز پڑا ہوا ہے کہ جلالین پڑھانے میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بس جلال الدین سیوطی نے

جلال الدین محلی نے مقدرات نکالدئے ہیں۔ان مقدرات کا ترجمہ کردیتے ہیں۔تفسیر کے آگے جو مقدر عبارت نکالی جو تفسیری کلمات انہوں نے ذکر کئے ہیں یا قرأت کا جو اختلاف بیان کیا ہے اس کا ترجمہ کردیتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اتنی بات جلالین میں کافی نہیں۔جلالین کے اندر پڑھانے کیلئے ضروری ہے کہ آپ ان مقدرات کا جو مفسر نے نکالے ہیں آیت کے ساتھ ان کا ربط بیان کریں کہ یہ مقدر عبارت جو نکالی جارہی ہے اس آیت کے ساتھ اسکی کیا مناسبت ہے۔اور اس تقدیر کے بغیر اس عبارت کا مطلب نہیں سمجھا جاسکتا۔اس مقدر کا عبارت کے ساتھ گہرا تعلق اور بغیر اس مقدر کے نکالے ہوئے عبارت کا قرآن کریم کی آیت کا مطلب نہ سمجھنا یہ اس طالب علم کو بتایا جائے کہ اگر یہ عبارت مقدر نہ نکالی جائے تو آیت کا مطلب نامکمل رہے گا۔سمجھ میں نہیں آئے گا۔خالی ترجمہ کردینا کافی نہیں۔اس مقدر کا آیت کے ساتھ ربط بیان کیجئے، اسکی مناسبت بیان کیجئے، اس پر موقوف ہونا بیان کیجئے، یہ ضروری ہے ورنہ آپ نے مقدر کا ترجمہ کردیا طالب علم کچھ سمجھا نہیں کہ تقدیر مصنف نے کیوں نکالی۔ بعض وقت مصنف تقدیری عبارت نکالتے ہیں اسکے اندر کسی اشکال کا جواب دینا ہوتا ہے بعض مرتبہ کسی نحوی ترکیب کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔مقدر عبارت اسلئے نکالی آپ نے اسکو کچھ بتلایا ہی نہیں۔

دوسری بات جلالین میں اس سے زیادہ اہم وہ یہ ہے کہ وہاں آپ آیات کی ترکیب کا اہتمام کریں اور قرآن کریم کی آیات کے جو مقدرات نکالے ہیں ان کی بھی ترکیب کریں۔اور نفس آیات کا بھی ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ ترکیب نحوی کریں جلالین کے اندر ترکیب کا رواج ہمارے مدارس کے اندر تقریباً معدوم ہے۔میں نے الحمدللہ بہت عرصہ جلالین پڑھائی، ساری کتابیں الحمدللہ عرصہ دراز تک ہوتی رہیں تقریباً اٹھارہ سال تک میں جلالین پڑھاتا رہا۔اس کا ہمیشہ اہتمام کرتا تھا کہ قرآن کریم کی آیات کی ترکیب اور جو مقدرات وہاں پر ہیں ان کی ترکیب اور یہ جو بات میں نے عرض کی کہ تقدیر کی ضرورت کیا ہے اور مناسبت اسکی آیت سے کیا ہے اسکا اہتمام کئے بغیر میں بالکل نہیں چلتا تھا۔ چنانچہ اسکا طلبہ کو بہت فائدہ ہوا۔

تیسری بات یہ ہے کہ جلالین کا جو حاشیہ ہے اس حاشیہ کے اندر رطب ویابس بہت ہے بعض

چیزیں سقیم ہیں اور جمہور کے مسلک کے خلاف تفردات ہیں تو ان حاشیوں کو طلبہ دیکھتے ہیں اور وہ حاشیہ دیکھ کر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ شاید قرآن کی اس آیت سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے یا یہ واقعہ قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے۔ آپ اسکی فکر کیجئے کہ جلالین کے حواشی میں جو رطب ویابس اور صحیح وسقیم چیزیں ہیں ان میں تمیز بیان کریں، طالب علم کو یہ بتائیں کہ یہ بات یہاں سقیم ہے، یہ بات صحیح ہے اور یہ بات کمزور ہے یہ بات یہاں پر غلط ہے اسکا کوئی ثبوت نہیں، جیسا کہ ہاروت وماروت کے واقعہ کے اندر اس قسم کی بڑی لمبی چوڑی بحثیں وہاں کی گئی ہیں۔ اسی طریقہ سے تلك الغرانيق العلىٰ کے اندر، سورہ نجم کی تفسیر کے اندر اس قسم کی باتیں حواشی کے اندر ہیں۔ طلبہ کو یہ بتلانا چاہئے کہ یہاں صحیح یہ ہے، سقیم بات یہ ہے اور آیت کی صحیح توجیہ کر کے بتلائیں کہ یہ ہے اصل توجیہ آیت کی صحیح مراد یہ ہے یہ بات آپ کب کر سکتے ہیں؟ یہ جب کر سکتے ہیں کہ جب جلالین کے ساتھ ساتھ دوسری تفاسیر کو بھی دیکھیں۔

جلالین کی تدریس کیلئے ضروری یہ ہے کہ آپ دوسری تفسیروں کا مطالعہ کریں تاکہ جو باتیں یہاں اجمال ہیں وہ ذرا تفصیل سے آجائیں۔ سقیم باتیں حواشی کے اندر ہیں تو اسکی اصلاح ہو جائے "صاوی" اور "جمل" یہ دو حواشی عام طور پر مشہور ہیں "صاوی" کے بارے میں تو عام طور پر یہ تاثر ہے اور خود بھی تجربہ ہے کہ اسکی بہت سی باتیں ضعیف ہوتی ہیں کچھ مبتدع بھی معلوم ہوتی ہیں۔ کچھ میلان ان کا ابتداع کی طرف ہے۔ اس لئے اس پر تو زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ "جمل" البتہ ایسی ہے کہ وہ مقدرات اور ترکیب وغیرہ کے بارے میں معتبر ہے لیکن میرا مشورہ آپ حضرات کو یہ ہے کہ آپ تفسیر پڑھانے کیلئے جلالین پڑھائیں تو اس وقت خاص طریقہ پر ان تفاسیر کو اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ اگر آپ کو خالی اردو کے ترجمہ پر اکتفا کرنے کی عادت نہ ہو۔ یا خالی رواروی سے گزر جانے کا مزاج نہ ہو۔ محنت کرنے کا شوق اور جذبہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائیں۔ تو آپ اپنے مطالعہ میں "تفسیر مدارک" کو سب سے مقدم رکھیں۔ علامہ نسفی کی تفسیر مدارک سب سے مقدم رکھیں۔ نہایت ہی مفید اور نہایت ہی جامع اور مختصر اور مسلک کے اعتبار سے بھی حنفی، اسکو اپنے مطالعہ میں بالالتزام رکھئے۔ اسکے بعد دوسری تفسیر جو آپ کو مزید مباحث کیلئے مفید ہوگی وہ "تفسیر مظہری" ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی

نہایت عمدہ تفسیر ہے۔اور ان کی خوبی یہ ہے کہ بیک وقت مفسر بھی ہیں، محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، قاضی بھی ہیں، حنفی بھی ہیں اسلئے یہ تمام مباحث کو ہر حیثیت سے بیان کرتے ہیں اور قابل اعتماد طریقہ پر بیان کرتے ہیں۔اگر آپ کو کسی مسئلہ کے اندر فقہی اختلافات یا فقہی دلائل مطلوب ہوں تو مظہری میں آپکو مل جائیں گے۔حدیث کے اعتبار سے اگر آپ نے کوئی کلام دیکھنا ہے کسی آیت کے ذیل کے اندر تو تفسیر مظہری میں آپکو دستیاب ہے اگر آپ کو کسی مفتٰی بہ قول کی تلاش ہے کسی آیت کے ذیل کے اندر کسی مسئلہ میں تو مظہری میں وہ آپکو ملے گا۔تفسیری نکات آپکو تلاش کرنے ہیں تو تفسیر مظہری میں آپکو وہ ملیں گے۔اور پھر یہ کہ آیات کے حل کیلئے بڑے مختصر انداز میں جیسا کہ مدارک کا انداز ہے اختصار کا حلّ آیات کے سلسلے میں بہت ہی سہولت کے ساتھ آسانی کے ساتھ مختصر انداز میں کلام کردیں گے۔اسلئے مظہری نہایت عمدہ تفسیر ہے۔یہ دونوں تفسیریں میں نے عرض کیں کہ فن تفسیر پڑھانے والے استاد کو ان سے استغناء نہ ہونا چاہئے۔

فہم قرآن باعتبار بلاغت:

اب باعتبار فن بلاغت کے اگر آپ قرآن کریم کو سمجھنا چاہیں۔قرآن کو تفسیری حیثیت سے آپ نے ان تفسیروں کی مدد سے سمجھا لیکن اگر باعتبار بلاغت کے قرآن کو سمجھنا چاہیں تو پھر علامہ زمخشری کی ''تفسیر کشاف'' اسکے لئے ناگزیر ہے۔تفسیر کشاف کے بغیر آپ قرآن کو فن بلاغت کے اعتبار سے نہیں سمجھ سکتے۔

بیت :

مافھم القرآن الا الاعرجان احلھما من زمخشر والاخر من جرجان

قرآن کو بلاغت کے اعتبار سے دو لنگڑوں نے ہی سمجھا ہے۔ایک جار اللہ زمخشری اور دوسرا عبد القاہر جرجانی اتفاق سے دونوں ہی اعرج ہیں۔زمخشری سے کسی نے پوچھا کہ آپکے پاؤں کے اندر جو لنگڑاہٹ ہے اسکی وجہ کیا ہے کیسے ہوئی تو انہوں نے ایک مرتبہ تو یوں کہا کسی موقع پر میں خوارزم کے پہاڑوں میں جارہا تھا برف پڑ رہی تھی بہت سخت برفباری تھی وہاں میں پھسل گیا۔تو میری ٹانگ ٹوٹ گئی

اور اس وقت سے یہ لنگڑاہٹ میری ٹانگ کے اندر ہے لیکن دوسری روایت جو انہی سے ہے وہ زیادہ قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ میں نے بچپن کے اندر ایک چڑیا پکڑلی اور اس چڑیا کے پاؤں کے اندر دھاگہ باندھ لیا اب وہ اڑ نہیں سکتی تھی ایک مرتبہ وہ دھاگہ چھوٹا تو وہ اڑی تو میں نے اسکو دبوچ لیا۔ پھر وہ نیچے گری تو اسکے نیچے گرنے سے اسکی ٹانگ ٹوٹ گئی تو میری ماں بڑی ناراض ہوئی اور یہ کہا کہ تو نے چڑیا کی ٹانگ توڑی اللہ کرے تیری بھی ٹانگ ٹوٹ جائے تو نے اس پرندہ کی ٹانگ توڑ دی تو میری ماں کی بددعا مجھے لگی اور میں سواری سے گرا اس طریقہ سے میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بہرحال وجہ کوئی بھی ہو۔ تھے اعرج اسلئے مشہور مقولہ ہے، ما فهم القرآن الا الاعرجان احدهما من زمخشر والآخر من جرجان . زمخشر خوارزم کا علاقہ ہے ماوراء النھر کا۔

تو اگر بلاغت کے لحاظ سے سمجھنا ہے تو پھر زمخشری کی کشاف سے استغناء نہیں ہوسکتا۔ لیکن زمخشری کی کشاف کو بھی سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ نے بلاغت پر کوئی محنت کی ہوئی ہو۔ جیسا کہ کہتے ہیں شرح عقائد کیلئے علامہ خیالی نے حاشیہ لکھا، تو خیالی لکھا شرح عقائد کے حل کیلئے خیالی کو سمجھنے کیلئے بھی حاشیہ کی ضرورت ہے۔ تو علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے ہم پر احسان کیا، رحم کیا کہ انہوں نے حاشیہ لکھا خیالی کا۔ اور اسے سہل کر دیا۔ بایں معنی کہ جن کے اندر استعداد ہے سیالکوٹی کی سمجھنے کی تو وہ خیالی کو حل کر لیں گے۔ ورنہ ان کا حاشیہ بھی کوئی معمولی حاشیہ نہیں اسکے لئے بھی ایک حاشیہ کی ضرورت ہے لیکن ایک بات میں عرض کر دیتا ہوں کہ زمخشری کی کشاف سے مفسر کو استغناء نہیں ہوسکتا۔ بغیر کشاف کے آپ قرآن بلاغت کے اعتبار سے نہیں سمجھ سکتے۔ طلبہ کو نہیں بتا سکتے۔ لیکن کشاف مطالعہ کرتے وقت حواس عشرہ کو درست رکھ کر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسلئے کہ زمخشری معتزلی ہے۔ اور وہ عبارات کے اندر اعتزال کی طرف ایسے لطیف انداز سے اشارہ کر جاتے ہیں کہ آدمی اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اور پتہ نہیں چلتا کہ میں معتزلی ہو گیا ہوں میں نے اعتزال کا عقیدہ اپنا لیا ہے یا معتزلہ کی بات کو قبول کر لیا ہے پتہ بھی نہیں چلتا۔

چنانچہ زمخشری کے اعتزال کی ایک بات مجھے یاد آگئی ایک صاحب کشف ونسبت بزرگ تھے ان کی مجلس ہو رہی تھی بڑی معرفت کی مجلس تھی اتفاق سے اس مجلس کے اندر ایک صاحب آئے کوئی عالم

تھے انکے پاس چادر میں ایک کتاب لپٹی ہوئی تھی وہ آئے اور انیہ مجلس میں بیٹھ گئے شیخ کا کلام جاری تھا جب وہ صاحب آ کر بیٹھے تو شیخ کلام کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ ادھر ادھر دیکھا فاصلہ سے ایک کونہ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے شیخ کو نظر نہیں آئے۔ تو شیخ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا مجلس میں کوئی آدمی آیا ہے لوگوں نے کہا کہ حضرت ایک مولوی صاحب آئے ہیں۔ وہ وہاں کونے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ انکو بلاؤ وہ آئے تو چادر کے اندر ایک کتاب لپٹی ہوئی شیخ نے انکو قریب بلایا بلا کر پوچھا کہ مولانا یہ آپ کے پاس کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت یہ ایک کتاب ہے تفسیر کشاف شیخ نے کہا کہ اچھا تو شیخ نے ان سے فرمایا تواضع کے ساتھ کہ آپ سے درخواست ہے کہ یہ کتاب باہر رکھ دیں تو انہوں نے وہ کتاب باہر رکھ دی جب وہ واپس آئے تو شیخ کی مجلس بھی باغ و بہار بن گئی اور پھر کلام کا سلسلہ اسی طرح شروع ہو گیا۔ بعد میں کسی شخص نے شیخ سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا قصہ تھا کہ آپ نے تفسیر کی کتاب کو باہر رکھوا دیا تو شیخ نے جو بات فرمائی وہ قابل غور ہے شیخ نے فرمایا کہ: تفسیر کشاف بلا شبہ تفسیر ہے قرآن کو بلاغت کے اعتبار سے تو کشاف کے بغیر کوئی سمجھنا چاہے تو ممکن نہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کا لکھنے والا معتزلی ہے اور اعتزال میں ایک ظلمت ہے۔ سنت کی ضد ہے اعتزال، سنت کا نور اس میں نہیں ہے تو جو معتزلی ہوتا ہے اس میں بھی اعتزال کی وجہ سے ظلمت آ جاتی ہے۔ اسکی تصنیف کے اندر بھی ظلمت اسکی اس کتاب کے اندر بھی آتی جب یہ کتاب میری مجلس میں آئی تو میرے قلب کے اندر تاریکی طاری ہو گئی۔ ظلمت کا اثر ہوا میری زبان بولتے بولتے بند ہو گئی۔ وہ جو نورانیت تھی مجلس کی اس کتاب کے آنے کے بعد اسکی ظلمت سے بے نور ہو گئی جب یہ کتاب میں نے باہر رکھوائی ظلمت ختم ہو گئی۔ اب ان باتوں کا ادراک کون کریگا ان باتوں کا ادراک وہ کریگا جس کا قلب پہلے سے صاف وشفاف مجلّی و مصفّٰی ہو۔ ہمارے قلوب ان چیزوں کا ادراک نہیں کرتے، ہمارے قلب تو پہلے سے ہی تاریک ہیں سیر کی جگہ سوا سیر تاریکی پڑ جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہاں تو قلب مصفی ہے صاف آئینہ پر ذرا سی دھندلاہٹ آ جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا۔ لیکن اگر پہلے سے کالا ہو تو چھٹانک سیاہی اور ملاؤ کیا فرق پڑتا ہے

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس کا احساس رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے اندر مبتلا ہو جاؤ۔ اللہ

جزائے خیر دے کشاف کے اوپر تعلیق کرنے والا ایک کٹر اہلسنت محقق ہے وہ حاشیہ کے اندر تعلیقات میں کشاف کی نشاندہی کرتے چلتے ہیں کہ اس جگہ یہ بات محمود زمخشری نے معتزلہ کی حمایت میں کہہ دی ہے۔ یہاں معتزلہ کی طرف اس کا جھکاؤ ہے اسلئے جب کشاف دیکھو حاشیہ اسکا ضرور دیکھو اسکے ساتھ۔ تو اسکے بغیر کوئی مفر نہیں اگر تفسیر کو سمجھنا ہے بلاغت کے لحاظ سے۔

اسکے علاوہ ہمارے یہاں تفسیر کے دو طریقے ہیں ایک تفسیر روایت کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور ایک تفسیر بالدرایت ہوتی ہے۔ تفسیر بالدرایت کا مطلب یہ ہے کہ آپ روایات کا سہارا کم لیں قرآن کو قرآنی علوم کی روشنی کے اندر اس طریقہ پر سمجھیں کہ عقل بھی اسکے ساتھ ساتھ آپ کا تعاون کرے اور قرآنی مفہوم عقل کی روشنی کے ساتھ تفسیر کی مدد سے آپ متعین کریں۔ لیکن روایات کا سہارا اس میں کم لیں بعض تفسیروں کا مزاج یہ ہے کہ تفسیر روایت ہی سے کرتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ مطلوب ہو کہ کسی آیت کے ذیل میں احادیث کا کیا ذخیرہ ہے تو ''تفسیر ابن کثیر'' اور ''تفسیر ابن جریر'' دونوں تفسیریں نہایت ہی عمدہ اور اعلیٰ ہیں جو آپکو ایک آیت سے متعلق تمام احادیث کے ذخیرہ کو یکجا طریقہ پر میسر آجائے۔ ایک آیت کے متعلق حضور ﷺ کے ارشادات کیا ہیں۔ ویسے تو سیوطی کی درمنثور بھی ہے لیکن اس میں رطب و یابس بہت ہے۔

اگر نحوی ترکیب کے اعتبار سے آپ چاہیں کہ قرآن کی مختلف ترکیبیں اور رواۃ سے مختلف اقوال اور آیات کے اندر تقدیرات معلوم ہوں تو ''تفسیر روح المعانی'' کو آپ اختیار کریں۔ علامہ آلوسی کی روح المعانی نحوی اعتبار سے نہایت مفید ہے۔ اسکے علاوہ تفسیر قرطبی ہے اور تفسیر بحر محیط ہے یہ تفسیریں وہ ہیں جن کے اندر مفسرین کے اقوال ہیں کسی کو اگر شوق ہو تو تفسیر قرطبی اس سلسلہ میں جن کے اندر مفسرین کے اقوال ہیں بہت نافع ہے اور بحر محیط بھی کہ اسکے اندر بہت سے اقوال، بہت سے واقعات اور بعض چیزیں رطب و یابس بھی ہیں لیکن ایک استاد جس کے پاس وقت کی زیادہ فرصت نہیں ہوتی اسکے لئے میں نے عرض کیا کہ آپ جلالین سے اس بات کی عادت ڈالیں کہ آپ کے مطالعہ میں تفسیر مدارک بھی ہو تفسیر مظہری بھی ہو اسکی مدد سے آپ جلالین پڑھائیں اور اسکے ساتھ ساتھ تفسیر کشاف کی توفیق ہو تو بلاغت کے اعتبار سے سمجھیں باقی روایات کیلئے ابن کثیر اور ابن جریر موقع اور فرصت ہو تو اسکو اختیار کریں یہ اہم تفسیریں ہیں۔

اب اسکے بعد آخری بات یہ ہے کہ ساتواں درجہ آ گیا جن مدارس کے اندر تفسیر بیضاوی پڑھائی جاتی ہے۔ تفسیر بیضاوی بڑی عجیب تفسیر ہے۔ علامہ بیضاوی نے اسرار التاویل و انوار التنزیل اسکا نام رکھا۔ اس کا ماٗخذ علامہ راغب اصفہانی کی تفسیر اور علوم عقلیہ علامہ رازی کی تفسیر کبیر سے اور بلاغت کشاف سے اور لغات اصفہانی سے لئے ہیں تو تفسیر کبیر اگر نظر سے گزری ہو تو بیضاوی میں بہت آسانی ہوگی۔

شیخ زادہ کا تفسیر بیضاوی پر بڑا ہی عجیب اور سہل حاشیہ ہے۔ تفسیر بیضاوی کا متن جان لیوا ہے۔ گیارہ گیارہ فنون سے بیک وقت بحث کرتے ہیں اب تو لوگوں نے ترجمہ کردیا ہے۔ تقریر الحادی کے نام سے ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں اغلاط ہیں وہ تو وہی سمجھے گا جس نے اصل راجع ماخذ دیکھے ہوں۔

علوم قرآن:

علوم قرآن کسی کتاب کا نام نہیں ہے درحقیقت وہ علوم ہیں جن سے قرآن بنیادی طریقہ سے بحث کرتا ہے۔ ان کو بلاواسطہ قرآن سے سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں توحید کا ذکر ہے مکہ کی آیاتِ توحید کا مزاج اور ہے اور مدینے کی آیاتِ توحید کا مزاج اور ہے تو کونسی آیات مکہ میں نازل ہوئیں اور کون سی آیات مدینہ میں۔

اسی طرح قرآن کا اعجاز، وجوہ اعجاز کتنی ہیں۔ اس بارے میں بھی مختلف کتب ہیں۔ ان کے اندر بعض نے بائیس، بعض نے پندرہ، بعض نے سترہ بتائی۔ مثلاً علامہ زَمَلکانی، قاضی ابوبکر باقلانی اور حافظ سیوطی نے مستقل کتابیں اس بارے میں تصنیف فرمائی ہیں۔ ایک بات یاد آ گئی کہ قرآن کا اعجاز عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کو ادنیٰ سے ادنیٰ وقت میں پڑھا جاسکتا ہے، حفظ کیا جاسکتا ہے۔

امام محمد کا پورے قرآن کو ایک ہفتہ میں حفظ کرنے کا واقعہ کہ امام ابوحنیفہ کے پاس آئے اس کے بعد قریب آئے، پہلے حفظ قرآن کے بغیر حدیث، فقہ نہیں پڑھاتے تھے پوچھا برخوردار حفظ کر لیا؟ کہا نہیں! ایک ہفتہ کے بعد آئے کہا حضرت پورا قرآن حفظ کرکے آیا ہوں۔ اسی طرح امام زہری کے متعلق آتا ہے کہ اسّی (۸۰) دنوں میں پورا قرآن حفظ کرلیا۔ دارالعلوم میں ایک طالب علم نے تین ماہ میں یاد کرلیا۔

پڑھنے کا اعجاز یہ ہے کہ مولانا اسماعیل شہید نے لکھنؤ کے قریب لشکر جمع تھا کسی نے کہا حضرت داؤد علیہ السلام اپنی کتاب زبور کو اتنی دیر میں پڑھ لیتے تھے کہ ایک رکاب میں پاؤں ڈالکر جب دوسری رکاب میں پاؤں ڈالتے تو پوری کتاب پڑھ لیتے تھے۔ فرمایا زبور صرف مناجات ہے اور نبی کا معجزہ ہے۔

اس امت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگ پیدا کیے ہیں جو تھوڑے وقت میں قرآن جیسی کتاب پڑھ لیتے ہیں۔ مولانا اسماعیل شہید نے ایک دن عصر کے بعد تلاوت شروع کی سورج غروب ہونے تک الناس پڑھ لی۔

قرآن پڑھاتے وقت قرآن کے علوم و معارف وجوہ اعجاز کی نشاندہی کرتے جائیں۔ علوم قرآن تفسیر قرآن کے ساتھ پورا ہوتا جائیگا۔

اللہ تعالیٰ مقصد کو پیش نظر رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆......☆......☆

حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی رحمۃ اللہ علیہ

﴿مورخہ ۱۱ ستمبر بروز جمعرات ۲۰۰۳ء﴾

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم o الرحمن o علم القرآن o خلق الانسان o علمه البيان o وقال تعالیٰ: وعلمك مالم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما o وقال تعالیٰ: وعلمناه من لدنا علما o وقال عليه الصلوة والسلام: من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين. او كما قال عليه الصلوة والسلام.

قابلِ احترام معلمین ومعلمات۔ دنیا میں شاید سب سے مشکل کام یہ ہے کہ انسان علماء سے بات کرے غالباً یہ سب سے مشکل ترین کام ہے۔ حضرت مولانا مفتی انور شاہ صاحب دامت برکاتہم جو پہلے وفاق المدارس کے ناظم امتحان تھے۔ آپ میں سے بعض حضرات ان کو یقیناً جانتے ہوں گے۔ وہ جامعہ قاسم العلوم ملتان میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تقریباً ۲۵، ۳۰ سال رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت مفتی محمود صاحبؒ فرماتے تھے کہ عالم کا دوسرے عالم کے سامنے، وعظ کرنا ایسا ہے جیسے کہ ایک سبزی فروش دوسرے سبزی فروش کو اپنی سبزی بیچے۔ ایک آدمی کے پاس سبزی موجود ہے اور دوسرے کے پاس بھی وہی تمام اقسام کی سبزی موجود ہے تو پہلا آدمی چاہے کہ اپنی سبزی اُسے فروخت کرے جس کے پاس سب کچھ پہلے ہی موجود ہے۔

تو اس لئے میں نے عرض کیا کہ یہ دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ مجھے فرمایا گیا ہے کہ میں فقہ کے متعلق آپ کے سامنے بیان کروں، مجھے مدرسہ میں پڑھاتے ہوئے یا مدرسہ میں رہتے ہوئے طالب علمی کے زمانہ سے غالباً (۱۹۶۱ء سے مدرسہ سے میرا تعلق ہے اور اب ۲۰۰۳ء ہے تو) ۴۲ سال ہوگئے ہیں، یہ عمر کا ایک طویل حصہ ہے ورنہ بہت کم خوش قسمت لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ۸۰ سال تک پہنچتے ہیں ورنہ اس سے پہلے ہی انتقال ہوجاتا ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: سنّ اعمار كم مابين ستين وسبعين "لیکن الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے ایک طویل عرصہ تک دینی مدارس کے ساتھ اور تعلیم وتعلم کے ساتھ نسبت عطا فرمائی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے۔

میں آپ کے سامنے چند ایسی باتیں عرض کروں گا جو ہوسکتا ہے کہ آپ کے علم میں پہلے ہی سے ہوں اور میری کسی بات سے شاید آپ کے علم میں اضافہ نہ ہو لیکن اسی بات کی تکرار کی جاتی ہے:
''وذکر فان الذکریٰ تنفع المؤمنین'' کے تحت۔ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے بھی فائدہ پہنچائیں۔

یہ حقیقت تو آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ معلم بننا اللہ تبارک وتعالیٰ کی نیابت بھی ہے اور رسول کی نیابت بھی ہے۔ قرآن کریم کی وہ ساری آیات آپ کے سامنے ہونگی جس میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم کی نسبت اپنی جانب کی ہے۔

وعلمناہ من لدنا علما یا اس قسم کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس علم کی نسبت اپنی جانب فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو تعلیم دے وہ معلم ہوتا ہے۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر معلم کا اطلاق جائز ہے یا نہیں، جن علماء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں ان کے نزدیک جائز نہیں ہے اور جن علماء کے نزدیک اسماء حسنیٰ توقیفی نہیں ان کے ہاں جائز ہے۔ یہ الگ مسئلہ ہے۔

یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی، الرحمن علم القرآن، اور نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا: وعلمك مالم تکن تعلم، ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس علم کی نسبت اپنی جانب کی ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب یہ کام اللہ تعالیٰ کی نیابت کا ہے، حضور ﷺ کی نیابت کا ہے تو ظاہر ہے کہ جتنا اس کا مقام اونچا اور جتنا اس کا مقام بڑا ہے اتنا ہی اس کام اور اس مقام کی نزاکتیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا اردو میں کسی کا شعر ہے:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

جن کا مقام بڑا ہوتا ہے تو مشکلات بھی ان کے لئے اتنی ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقام تعلیم پر یعنی معلم کے مقام پر فائز کیا ہے، گویا اپنی نیابت کے لئے اور حضور ﷺ کی نیابت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کا انتخاب فرمایا ہے۔ بہت خوش قسمتی کی بات ہے اور بڑا مقام ہے لیکن جیسے میں نے عرض کیا کہ جتنا مقام بڑا اس کی نزاکتیں اور اس کی مشکلات بھی اتنی ہی زیادہ ہیں۔

فقہ کی لغوی واصطلاحی تعریف:

علم فقہ کے متعلق یا فقہ کی تدریس کے متعلق مجھے آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فقہ کے لغوی معنی جیسے کہ آپ حضرات کو معلوم ہے "سمجھنے" کے ہیں اور اسی طریقہ سے سمجھانے کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (کسی چیز کو سمجھنا، سمجھانا)۔

درمختار کے مقدمہ میں حضرت امام بستوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ "فَقَہ" ماضی میں عین کے فتحہ کے ساتھ "فَقِہ" ماضی میں عین کے کسرہ کے ساتھ اور "فَقُہ" ماضی میں عین کے ضمہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔ معانی میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے لیکن مشترک معنی "ف، ق اور ہ" کا جو مادہ ہے اس مادہ میں مشترک معنی "سمجھ" کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کی تعریف بڑی مشہور ہے جو آپ حضرات کے علم میں ہے کہ "احکام شرعیہ فرعیہ کا علم حاصل کرنا، وہ احکام شرعیہ فرعیہ جو حاصل کئے گئے ہوں ادلۂ تفصیلیہ سے"۔ "هو العلم بالاحكام الشرعية الفرعية المكتسبة من ادلتها التفصيلية" یہ اس کی مشہور تعریف ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مختصر تعریف منقول ہے۔ جو توجیہ وغیرہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمائی ہے کہ انسان کا علم حاصل کرنا ما لھا و ما علیھا کا یعنی جو اس کے لئے فائدہ مند اور نقصان دہ ہے ان کا علم حاصل کرنا۔

علم فقہ کا موضوع:

علم فقہ کا موضوع، مکلّف کے کرنے کے افعال اور اعمال ہیں۔ اور مکلّف کے کرنے کے افعال اور اعمال میں عوارض آجاتے ہیں۔ پھر اس علم میں اُن کی بحث ہوتی ہے۔ غرض تمام علوم شرعیہ کی ایک ہی ہے وہ "الفوز بسعادة الدارين" کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرکے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کریں۔

محدثین یا فقہاء کی اصطلاح میں فقیہ:

محدثین یا فقہاء کی اصطلاح میں فقیہ کس کو کہتے ہیں؟ درمختار کے مقدمہ میں اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح میں ذکر فرمایا کہ بعض فقہاء کے نزدیک فقیہ ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو

علم بالاحکام رکھتا ہو یعنی احکام شرعیہ فرعیہ جو مکتسب ہوں ادلہ تفصیلیہ سے اس کا علم رکھتا ہو وہ فقیہ ہے۔ اب احکام جمع کا لفظ ہے اور جمع کے لفظ کا اطلاق اقل چیز پر ہوتا ہے کبھی دو پر بھی ہوتا ہے کبھی تین پر یعنی علی الاقل چیز پر ہوتا ہے۔ اس لئے بعض نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کو تین مسائل بھی مکتسبہ من ادلتها التفصیلیة معلوم ہوں تو وہ فقیہ ہے لیکن یہ بڑا مشکل کام ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے طہارت کے، وضو کے مسائل معلوم کر لئے ہیں۔ یہ وضو کے سنن ہیں، یہ مسائل ہیں، یہ فرائض ہیں تو ہم فقیہ بن گئے حالانکہ فقہاء کے نزدیک فقیہ کا اطلاق یا مفتی کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جسے مقام اجتهاد حاصل ہو، وہ مجتهد ہو۔ اس کو فقہاء کی اصطلاح میں فقیہ کہتے ہیں، مفتی کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ فقیہ وہ ہے جس شخص کو تین مسائل کا العلم بالاحکام الشرعية الفرعية یعنی احکام شرعیہ کا علم حاصل ہو، اور احکام بھی مکتسب ہوں، حاصل کردہ ہوں ادلہ تفصیلیہ سے۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ فقہ کے مآخذ ہیں کتاب اللہ، سنت، اجماع اور اجتهاد، کتاب اللہ میں آیات احکام مأخذ ہے، آیات انذار اور آیات قصص پر بہت کم مسائل مستنبط ہیں۔ عام طور پر مسائل کا استنباط آیاتِ احکام سے ہوتا ہے۔ اب آیاتِ احکام کا علم صرف اتنا نہیں کہ آپ کو پتہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ آیت یوں ہے اور اس کی تفسیر فلاں عالم نے یوں بیان کی ہے۔ نہیں، بلکہ آپ کو اس آیت کے الفاظ کا بھی صحیح علم حاصل ہو، صحیح تلاوت اور قرأت کا علم بھی حاصل ہو، یہ آیت کب اتری اور کیسے اتری؟ شان نزول کے متعلق بھی اور اس آیت کی تفسیر میں احادیث مرفوعہ اگر ہیں تو اس کا بھی علم جرحاً اور تعدیلاً سند کے ساتھ حاصل ہو پھر ان احادیث کی معارض اگر کوئی اور احادیث ہوں تو انکا اور ان کی اسانید کا جرحاً اور تعدیلاً علم آپ کو ہو پھر اس آیت کے مطابق اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوال تابعین رحمۃ اللہ علیہم اگر ہوں تو اس کا بھی آپ کو علم ہو۔

مسئلہ اگر حدیث سے مکتسب ہے تو فقیہ اسے کہیں گے کہ جس کو احادیث احکام کا علم حاصل ہو (یاد ہو) حدیث کے متن اور اس کی سند پر محدثین کی مباحث ہیں اس کا علم ہو، پھر اگر اجماع ہے تو اس کے متعلق یہ علم ہو کہ یہ اجماع کب ہوا اور کن علماء کا ہوا کیا ایسے علماء تھے جن کا اجماع قابل اعتماد ہے یا ایسے علماء تھے جن کا اجماع قابل اعتماد نہیں؟ اور اگر قیاس ہے تو کس مجتهد کا ہے؟ اس لئے کہ یہ

بات تو آپ کو معلوم ہے کہ فقہ کا ایک ماٴ خذ قیاس ہے تو اس میں ہر آدمی کا قیاس معتبر نہیں ہے بلکہ صرف مجتھد کا قیاس معتبر ہے اور اس کے قیاس سے مسئلہ ثابت ہوتا ہے ہر آدمی کے قیاس سے مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ تو اب جس آدمی کو تین مسائل اس تفصیل کے ساتھ معلوم ہوں تو وہ فقیہ ہوگا۔ بھائی! مجھے تو اس تفصیل کے ساتھ اللہ گواہ ہے کہ معلوم نہیں ہیں۔ آپ میں سے بھی بہت کم حضرات ایسے ہوں گے جن کو یہ معلوم ہوں تو ظاہر ہے کہ جن فقہاء نے یہ فرمایا کہ ہر وہ آدمی فقیہ ہے جس کو تین مسائل معلوم ہوں تو اس سے مراد اس تفصیل کے ساتھ اس کو ان مسائل کا علم ہو، تو ظاہر ہے کہ اس تفصیل کے ساتھ ایک مسئلہ معلوم کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے، تو یہ جس کو فقیہ سمجھتے ہیں اور مفتی کہتے ہیں تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات ذکر کی ہے کہ متقدمین اور خلف کی اصطلاح میں مفتی کا اطلاق صرف اور صرف مجتہد پر ہوتا ہے، حافظ بالمسائل پر مفتی کا اطلاق مجازاً ہے۔ جس کو مسائل سارے کے سارے یاد ہوں یہ مسئلہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یوں ہے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یوں ہے، یہ ساری چیزیں اس کو یاد ہوں۔ اور مجھ جیسے لوگوں پر خالص الزام ہے۔ مجازاً بھی نہیں، نقلی بھی نہیں، کیونکہ فقہاء فرماتے ہیں مجازاً تو اگلا درجہ ہے۔ مجھ جیسے جتنے لوگ ہیں یہ درحقیقت ناقل ہیں راوی ہیں بشرطیکہ نقل کا صحیح طریقہ آئے۔ اب تو صورتحال یہ ہے کہ ہمیں مسئلہ معلوم نہیں ہوتا، کتاب الطہارۃ کا مسئلہ کتاب البیوع میں ڈھونڈتے ہیں پھر شکوہ کرتے ہیں کہ مسئلہ نہیں ملتا۔ یہ عمومی حال ہے ہمارا، تو فقیہ جس کے سارے فضائل اور مناقب ہیں وہ فقہاء اور محدثین کی اصطلاح میں یہ ہے جو میں نے ذکر کیا ہم کہتے ہیں یہ سارے فضائل ہمارے ہیں، تو یہ ہمارے نہیں۔ فقیہ کے متعلق اگر کچھ معلومات آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول سناتا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ تفاصیل آپ کو چاہئے تو دو کتابیں دیکھیں خطیب البغدادی کی کتاب ''الفقیہ و المتفقہ'' اور حافظ عبدالبر مالکی کی کتاب ''جامع بیان العلم و فضلہ'' حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے ایک دن مسئلہ پوچھا انہوں نے مسئلہ بتادیا جو شاگرد بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے کسی نے کہا: الفقہاء یخالفونك، فقہاء آپ کی مخالفت کرتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا: ثکلتك امك ارایت الفقیہ بعینك، کہا تیری ماں تجھ کو روئے کیا تم نے اپنی آنکھوں سے فقیہ کو دیکھا ہے، فقیہ کسے کہتے ہیں؟ پھر فرمایا الفقیہ: الزَّاھِدُ فِي الدُّنْیَا الرَّاغِبُ فِي الاٰخِرَۃِ کہ جس کے اندر یہ صفت موجود ہو کہ دنیا سے بے رغبت اور آخرت کے اندر رغبت رکھنے والا

ھوالبَصِیرُ بِعُیُوْبِ نَفْسِہ جسے اپنے عیوب معلوم ہوں اور اپنے عیوب کا اقرار بھی ہو گویا معلوم ہونے کے ساتھ ان عیوب کا علاج اور تدارک کی فکر بھی کرے، یہ صفات جس کے اندر موجود ہوں وہ فقیہ ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ہم لوگ خوش ہوتے ہیں ایک دوسرے کو کہتے ہیں یہ فقیہ الفجر ہے، دوسرے کو کہتے ہیں یہ فقیہ الظہر ہے، تیسرے کو کہتے ہیں یہ فقیہ العصر ہے، چوتھے کو کہتے ہیں یہ فقیہ المغرب ہے، پانچویں کو کہتے ہیں یہ فقیہ العشاء ہے یہ ساری فضول باتیں ہیں۔ ایک دوسرے کو خوش کرتے ہیں فارسی کا مشہور مقولہ ہے ''تو مرا حاجی بگو من ترا حاجی بگویم'' تم مجھے حاجی کہو میں تمہیں حاجی کہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے جسے واقعۃً فقیہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس صفت سے اپنے خاص بندوں کو نوازتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ آپ نے پڑھا ہوگا اساتذہ سے سنا بھی ہوگا موفّق میں امام کے مناقب میں اسے ذکر کیا ہے کہ ایک دن اعمش کے درس میں ایک آدمی آیا غالباً وہ اعمش سلیمان بن مہران تھے۔ ان سے مسئلہ پوچھا کیونکہ وہ استاد تھے ان کو مسئلہ معلوم نہیں تھا انہوں نے فرمایا مجھے معلوم نہیں، پہلے زمانے میں یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی اور بڑی خاصیت تھی علماء کی کہ جو مسئلہ معلوم ہوتا تھا صرف وہ بتاتے تھے جس کا علم نہیں ہوتا تھا وہ نہیں بتاتے تھے اور ہماری حالت یہ ہے کہ مسئلہ معلوم نہ ہو تو بھی اس پر جرأت کرتے ہیں حالانکہ اس پر جرأت نہیں کرنی چاہئے۔ سنن دارمی میں یہ منقول ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی عادت تھی کہ ایک کے پاس مسئلہ آتا تھا وہ فرماتے جاؤ دوسرے سے پوچھو، سائل دوسرے کے پاس جاتا وہ کہتے جاؤ فلاں کے پاس جاؤ ۱۰، ۱۵، افراد سے گزر کر وہ سائل پھر پہلے کے پاس پہنچ جاتا حالانکہ مسئلہ ان میں سے ہر ایک کو معلوم ہوتا لیکن جرأت نہیں کرتے تھے۔ اس لئے مشہور ہے کہ جو جواب پر جرأت کرتا ہے وہ سب سے أَجْرَأُ عَلَى جَهَنَّم ہوتا ہے۔ یہ بہت مشکل ہے انسان کہتا ہے کہ مسئلہ یہ ہے، مطلب یہ ہے، اللہ کی شریعت یہ ہے اور اللہ کی شریعت کا مطلب یہ ہے، اللہ کے رسول کا اور اللہ کا حکم یہ ہے، کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آدمی کو معلوم نہ ہو کہ اللہ کی شریعت یہ ہے اور اللہ کے رسول کا حکم یہ ہے اور وہ بتائے۔ آج کل ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ لوگ کہیں گے کیسا مولوی صاحب ہے اس کو مسئلہ نہیں معلوم تو شرم آتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے لوگ اس پر زیادہ

اعتماد کرتے ہیں جو کہتا ہے مجھے معلوم نہیں ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اس کو جو مسئلہ معلوم ہوتا ہے وہی بتاتا ہے اور جو معلوم نہیں ہوتا وہ نہیں بتاتا۔

امام ابوحنیفہؒ نے کئی مسائل کے بارے میں فرمایا'' لا ادری...... ''اس لئے کہا گیا کہ'' من قال لاادری لما لم یدر فقد اقتدی فی الفقه بالنعمان ''اور یہ واقعہ تو آپ نے پڑھا ہوگا کہ مسجد اقصیٰ سے ایک آدمی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ۴۰ مسئلے پوچھنے آیا ۲۵ کا جواب دیا باقی کا جواب نہ دے سکے اس نے کہا حضرت میں لوگوں کو جا کر کیا کہونگا فرمایا کہہ دو مالک کہتا ہے مجھے نہیں معلوم۔ یہ اس زمانے کی سب سے بڑی خوش نصیبی تھی جو معلوم ہوتا تھا بتاتے تھے جو معلوم نہ ہوتا تھا نہ بتاتے۔

ہارون رشید کی مجلس کا واقعہ ہے قاضی آئے رشید نے مسئلہ پوچھا انہوں نے کہا معلوم نہیں ہے بادشاہ تھے غصہ آ گیا کہنے لگے پھر تم تنخواہ کس چیز کی لیتے ہو فرمایا تنخواہ ان مسائل کی لیتا ہوں جو میں جانتا ہوں اگر ان مسائل کی تنخواہ لوں جو نہیں جانتا تو آپ کا خزانہ میری تنخواہ کی کفایت نہ کرے۔ غرض یہ واقعہ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ اعمش نے کہا نہیں معلوم۔ رحمٰن بن حزم رحمۃ اللہ علیہ یہ بہت بڑے محدث تھے اعمش ان کا لقب ہے محدثین نے ان کے عجیب وغریب واقعات وحالات لکھے ہیں ان کی طبیعت میں مذاق بہت تھا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضرت اگر اجازت ہو تو میں بتاؤں کہا بتلادو! امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ بتادیا اب سائل چلے گئے تو اعمش نے کہا کہ نعمان یہ مسئلہ تم نے کہاں سے دیکھا، دلیل اس کی کیا ہے امام صاحب نے فرمایا کہ'' الحدیث کذاو کذا حدثنا کذا وکذا ''آپ نے یہ حدیث سنائی تھی اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کس طرح نکلتا ہے یہ استنباط اور اجتھاد سے، اعمش نے فرمایا: انتم الاطباء ونحن الصیادلة اور یہ بھی فرمایا کہ نعمان جس حدیث سے تم نے یہ مسئلہ نکالا ہے یہ مجھے اس وقت سے معلوم ہے جب تیری ماں کی تیرے باپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مسئلہ اس حدیث کے اندر ہے۔ تو غرض یہ ہے کہ استنباط واستخراج سے مسئلہ نکالنا یہ مفتی اور مجتھد کا کام ہے تو اس لئے اس کے بڑے بڑے فضائل ہیں بڑے بڑے مناقب ہیں کیونکہ جو کام مفتی کرتا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ اصول الفقہ کی جو چھوٹی کتابیں ہیں مثلاً: اصول الشاشی، نورالانوار، وغیرہ اور جو بڑی کتابیں ہیں اصول الفقہ کی ان میں اجتھاد کا ایک مستقل مبحث، مقصد ہوتا ہے اسی مقصد کے اندر ایک مسئلہ یہ ہے کہ کیا انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی

اجتہاد کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ دو قول ہیں: مشہور اور بہتر قول یہ ہے کہ ان کو بھی حق ہے اجتہاد کا اب ان کے اجتہاد میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے یا صرف صواب کا؟ دونوں کا احتمال ہے لیکن فرق یہ ہے کہ عام آدمی کا اجتہاد خطا ہو تو بھی اسے اجر ملتا ہے اور وہ خطا پر برقرار رہ سکتا ہے جبکہ نبی سے اگر خطا ہو تو فوراً وحی آتی ہے اور وہ خطا پر نہیں رہتا، یہ کام انبیاء کرام علیہم السلام کا کام ہے۔ اور جو فضائل اور مناقب احادیث میں بیان کئے گئے وہ ہم جیسے لوگوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان کے لئے ہیں جو حقیقۃً فقیہ ہوں، مجتہد و مفتی ہوں۔

تدریسِ فقہ:

اب فقہ کی پڑھائی کیسی ہونی چاہئے؟ تو آپ کی خدمت میں چند باتیں عرض کر رہا ہوں جو تجربہ کی باتیں ہیں ایک فقہ کی ابتدائی کتابیں ہیں اور ایک فقہ کی آخری کتابیں ہیں۔ میں نے جامعہ فاروقیہ میں پڑھا ہے حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم میرے استاد تھے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت کے حکم سے یہاں پڑھانا شروع کیا، پہلے میں نے تقریباً ۱۴ کتابیں پڑھائیں جس میں کافیہ، اصول الشاشی، کچھ درجہ ثانیہ، ثالثہ کی کتابیں اور کچھ درجہ رابعہ کی، تو اس زمانے میں بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ کنز پڑھانے والا استاد کنز ختم نہیں کرتا تو حضرت بہت غصہ ہوتے تھے فرمایا کرتے کہ ہم نے قدوری اور قدوری کے بعد کنز ایک سال میں پڑھی اور کافیہ اور کافیہ کے بعد شرح جامی ایک ساتھ ایک سال میں پڑھی۔ بیضاوی میں سورۂ بقرۃ ایک سال میں ایک استاد سے ختم کی۔ اب قدوری بھی تقسیم ہوتی ہے دو جگہ دو استاد پڑھاتے ہیں کنز بھی تقسیم ہوتی ہے۔ اول اور آخر ہم نے کنز ایک سال میں استاد سے بہت آسانی سے پڑھی اور کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اب بھی ایک حصہ پڑھاتے ہیں اور قدوری تو آدھی قدوری بھی استاد ایک سال میں ختم نہیں کر پاتا۔ ظاہر ہے کہ جن طلبہ کو آپ قدوری پڑھا رہے ہیں وہ درجہ ثانیہ کے ہیں اور ایک سال درجہ اولیٰ واعدادیہ میں رہ کر وہ آئے ہیں ان کے سامنے وہی تقریر کریں گے جو ترمذی میں کرتے ہیں اور ہدایہ میں کرتے ہیں تو نفع کے بجائے نقصان ہوگا، طلبہ پر رعب جھاڑنے کے لئے استاد لمبی تقریریں کرتا ہے کہ طلبہ سوچیں کہ یہ بڑے محقق استاد ہیں۔ یہ انسان کی فطری چیز ہے کہ اس کی تعریف کی جائے، اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جائے

کیونکہ انسان کے اندر نفس ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات بتاتا ہوں، احیاء علوم الدین میں امام صاحب نے شیطان ونفس کے دھوکوں کا ذکر کیا ہے۔ عجیب طرح سے نفس یا شیطان انسان کو دھوکہ دیتا ہے، بعض اوقات ہمارے سامنے کسی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم کوئی بات شروع کرتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ چلو چھوڑ وغیبت ہو جائے گی غیبت تو ہم نے کردی سامنے والا اگر گدھا نہیں تو وہ آپ کی بات کا مطلب سمجھ جائے گا۔ غرض نفس کے دھوکے بہت باریک ہوتے ہیں۔ انسان جو نفس وشیطان کے دھوکوں سے بچنا چاہتا ہے، وہ بھی قبر تک ان سے نہیں بچ پاتا، تو وہ شخص جس کو فکر ہی نہیں اس کا تو کہنا ہی کیا۔

ابتدائی کتب کے اندر سب سے آسان اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب طالب علم عبارت پڑھے تو اگر طالب علم میں صلاحیت ہے تو استاد، طالبعلم سے بلوائے کہ یہ فعل ہے، یہ فاعل ہے، یہ صفت ہے، یہ موصوف ہے، یہ مبتدا ہے، یہ خبر ہے، یہ مضاف ہے، یہ مضاف الیہ ہے، نہیں تو پھر استاد مختصراً یہ بتادے کہ عبارت یہ ہے اور مسئلہ یہ ہے، صورتِ مسئلہ بتادے، اور اس میں یہ چیز جائز ہے اور یہ چیز ناجائز ہے بس ختم، آگے یہ کہ اس کی دلیل کیا ہے، اس کی علت کیا ہے، اس میں فقہاء کے اقوال کتنے ہیں، ائمہ کا اختلاف کیا ہے، ہر امام کے قول کا ماٴخذ کیا ہے؟ یہ نہیں، یہ چیزیں ابتدائی طلبہ کے لئے مضر ہیں، یہ ان کے لئے نہیں ہیں۔

میں آپ کو ایک اور لطیفے کی بات بتاتا ہوں، طالب علم عام طور پر منطق کی کتاب نہیں پڑھتے اب تو کہتے ہیں سُلَّم کو بھی نکال دیا ہے وفاق والوں نے، پھر شاید قدوری کو بھی سمجھانے والا نہ ملے گا تو اس کو بھی نکال دیں گے، لیکن اس کا ایک بنیادی سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ عموماً ابتدائی کتابیں ایسے اساتذہ کو دی جاتی ہیں جن کا خود تجربہ نہیں ہوتا اور یہ ابتدائی کتب طلبہ کو سمجھا نہیں پاتے تو طالبعلم علم کی بنیاد سے ناواقف ہوتا ہے تو وہ جب آگے بڑھتا ہے تو ناواقفیت کی بناء پر وہ کامل استفادہ نہیں کرسکتا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہتے ہیں کہ منطق سمجھ نہیں آتی اب منطق کے اندر ایسی کونسی بات ہے، کیا انبیاء کی بات سے زیادہ پُرحکمت ہے ان کی بات؟ کہ انبیاء کی بات تو سمجھ میں آتی ہے اور افلاطون اور ارسطو جیسے گدھوں کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بات یہ ہوتی ہے کہ آپ طالب علم کو کس موقع پر یہ باتیں بتاتے ہیں کہ اس کا کچا ذہن ہے اور وہ ذہن جس میں صلاحیت نہیں اس کو قبول نہیں کرپاتا، استفادہ نہیں کرپاتا نتیجۃً اس کی استعداد ورر تی پھر آگے کر وہ کچھ نہیں سمجھ سکتا ا اگر اس کو مسئلہ معلو ہو ے تو اس کو

آگے ھدایہ میں صرف دلیل سمجھنی ہوگی، مسئلہ پہلے سے یاد ہوگا تو اس کے لئے آسانی ہوگی لہٰذا ابتدائی کتب کو ھدایہ یا ترمذی نہ بنایا جائے اور نہ ان کتب کو علم الجدل کی کتب بنایا جائے کہ فلاں نے یوں کہا اور اس کا جواب یہ ہے۔

لطیفہ:

میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب تیسیر المنطق ہے، اکابر میں سے ان کو کسی نے مدرس بنا کر بھیجا تو پہلے ہی دن انہوں نے طلبہ سے پوچھا کہ بتاؤ تحقیق سے پڑھو گے یا عام طریقے سے انہوں نے کہا کہ تحقیق سے، فرمایا: اچھا کل سے سبق شروع ہوگا۔ کل جب تشریف لائے، سلم پڑھا رہے تھے ''سبحانہ'' پر بات شروع کی اور اس پر ایک گھنٹہ کی تقریر کی پھر فرمایا: اس پر کچھ باتیں باقی ہیں اس پر کل تقریر ہوگی۔ پھر دوسرے دن تقریر کی اور فرمایا: کہ ابھی کچھ باتیں باقی ہیں ان پر تیسرے دن تقریر ہوگی پھر تیسرے دن بات ختم کر دی پھر چوتھے دن تشریف لائے تو طلبہ انتظار میں تھے کہ حضرت سبق پڑھائیں گے تو فرمایا کہ ہاں بھئی سناؤ۔ وہ تو ذہنی عیاشی تھی طلبہ کی، تو کوئی بھی نہ سنا سکا، حضرت نے یہ طریقہ اختیار بھی ان کی نصیحت کے لئے کیا تھا فرمایا: نالائقو! تم کہتے ہو کہ ہم تحقیق سے پڑھیں گے اب میں نے تین دن جو تمہارے سامنے تقریر کی تم میں سے ایک آدمی بھی اس کی ایک بات کی تفصیل نہیں سنا سکا، دیکھو میں نے بغیر تحقیق کے پڑھا لیکن اس کے پڑھنے سے مجھ میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ میں تمہیں تحقیق سے پڑھا سکتا ہوں۔ سمجھایا کہ یہ چیزیں مضر ہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں اب ایک ''سبحانہ'' پر کتنے ہی دن تقریریں کرلیں سلم کے طالب علم کو بالکل بھی فائدہ نہ ہوگا، غرض یہ تحقیقی تقریر تو نفس کی وجہ سے کرتے ہیں اور یہ کہ طالب علم کیا کہیں گے کہ کتنا نکما استاد ہے اسے کچھ بھی نہیں آتا لیکن یہ مضر ہے۔

ابتدائی کتب میں طالب علم کو صرف مسئلہ پر مرکوز رکھا جائے کہ طالب علم صرف مسئلہ سمجھے کہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا دلیل ہے؟ یہ سب آگے چل کر معلوم ہوں گی۔ اب آگے چل کر قدوری، کنز وغیرہ سب میں یہی ہو کہ آپ مسئلہ پڑھیں اس کی صورت بتائیں پھر آگے چلیں اس طرح آپ پوری کنز کو ایک سال میں نہیں بلکہ چار ماہ میں پڑھا سکتے ہیں فائدہ طالب علم کو بھی ہوگا اور استاد کو بھی ہوگا۔

اب ہمارے ہاں فقہ کی کتب میں جب ہم ابتداء کرتے ہیں تو قدوری سے کرتے ہیں اس میں ایک استاد کے پاس پہلا حصہ دوسرے کے پاس دوسرا حصہ، دوسرا حصہ تقریباً ختم ہوجاتا ہے۔ تیسرے میں پہلا حصہ پڑھتے ہیں شرح الوقایہ یا المختار پڑھتے ہیں تو پہلا حصہ پڑھتے ہیں۔ ھدایہ میں جا کر معاملات کی بات آتی ہے ورنہ اس سے پہلے جتنی کتب پڑھتے ہیں ان میں معاملات نہیں پڑھتے۔

دو عالم تھے ایک ھدایہ کے حافظ تھے دوسرے حافظ نہ تھے مگر سمجھ کر پڑھی ہوئی تھی تو ایک مسئلہ سامنے آیا جو حافظ تھے انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ ھدایہ میں نہیں ہے، دوسرے کہنے لگے کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں ہے، ھدایہ کھول کر وہ مسئلہ سمجھا دیا کہ یہ مسئلہ اس طرح اس مسئلے سے نکلتا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ اگر کتابیں سمجھ کر پڑھی جائیں اور اس میں لمبی مباحث و تقاریر نہ بھی ہوں تو اس سے طالب علم کی استعداد بنتی ہے۔

ھدایہ کے پڑھانے کا طریقہ:

ھدایہ کے پڑھانے کا آسان طریقہ میں آپ کو عرض کرتا ہوں (۱) جب ایک مسئلہ کی عبارت پڑھی جائے، تو مسئلہ نکلتا ہے قدوری سے یا امام محمد کی الجامع الصغیر سے تو آپ مسئلہ بتادیں کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے (۲) اس کے متعلق اختلاف، اگر اختلاف اس مسئلہ کے متعلق ہے تو اس کے اقوال (۳) صاحب ہدایہ صاحبین سے اگر اختلاف ہوتا ہے تو ان کی دلیل کو مقدم ذکر کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی دلیل کو مؤخر۔ تو آپ یہی صورت یہی طریقہ استعمال کریں یہ سب سے آسان اور اچھا طریقہ ہے وہاں بھی لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہیں لیکن استاد اپنے سمجھنے کے لئے مثلاً، جیسے قدوری کی شروح ہیں یا مثلاً کنز کی شرح البحر الرائق یا البحر الفائق ہے یا دوسری جو شروح ہیں ان کو استاد پڑھے لیکن جو کچھ استاد پڑھے اسے خود ہضم کرے آپ نے جو مطالعہ کیا وہ سارا کا سارا طالب علم کو بتانے کا نہیں ہوتا۔

مفتی اور معلم کے لئے احتیاط:

فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ فقیہ اور مفتی کے اندر یہ حس ہونی چاہئے یعنی کہ "سمجھ" کہ میں یہ مسئلہ جو

بتاؤں گا معاشرہ میں اس مسئلہ کا اثر کیا پڑے گا اسی کے ضمن میں یہ بات لکھی ہے کہ کتاب کے اندر لکھا ہوا ہر مسئلہ بتانے کا نہیں ہوتا۔ مثال پیش کی ہے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ ''ایک زمین خراجی زمین ہے اس زمین میں بہت صلاحیت ہے اعلیٰ سے اعلیٰ فصل پیدا کرنے کی مثلاً ''زعفران'' لیکن وہ اس میں ''جَو'' ہی بوتا ہے تو حاکم کو اختیار ہے کہ وہ ادنیٰ کے بجائے اعلیٰ کا خراج لے لیکن امام شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ **هذا مما يعلم ولا يفتى به** کہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ آپ کے علم میں آنا چاہئے لیکن آپ اس پر فتویٰ نہیں دیں گے کیونکہ اس طرح ہر ظالم بادشاہ کو اجازت مل جائے گی کہ وہ جس سے چاہے اعلیٰ کا خراج وصول کرے اور کہے کہ زمین میں اعلیٰ کی صلاحیت تھی لیکن تم نے اگائی نہیں تو مفتی کے لئے ضروری ہے کہ دیکھے کہ اس فتوے کا اثر کیا ہوگا ایسے ہی معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دیکھے کہ طالب علم کو کس چیز کی ضرورت ہے اسے بتانے کی کتنی باتیں ہیں یہ نہیں کہ جو کچا پکا آپ نے حفظ کیا جو شروح دیکھیں اسے بلاترتیب **كيف ما اتفق** سب اگل دیا جیسے آدمی الٹی کرتا ہے، اس سے نہ طالب علم کو فائدہ ہوتا ہے نہ استاد کو۔

تجربہ کی بات:

ایک تجربے کی بات عرض کرتا ہوں میری اتنی عمر گزر گئی کہ آپ میں سے اکثر کی عمر اتنی نہیں ہوگی مجھے ۳۱، ۳۲ سال پڑھاتے ہوئے ہو گئے آج کل جو ایک آفت آئی ہوئی ہے کہ ہر کتاب کی اردو شرح ہے۔ جامعہ فاروقیہ میں ہمارے ایک ساتھی تھے۔ اسے سلّم دی پڑھانے کے لئے تو انہیں اس سے کچھ مناسبت نہ تھی تو وہ درسگاہ میں طلبہ کو مطمئن نہیں کر پاتے تھے بلکہ درسگاہ میں وہ وقت کوئی قصہ کہانی میں گزارتے، ایک دفعہ طالبعلموں نے کہا کہ حضرت آپ آج کوئی سبق پڑھا دیجئے بہت دن سے سبق نہیں پڑھا تو کہنے لگے کہ دراصل ایک کتاب میرے گھر پر ہے اور ایک کتاب مدرسے میں میرے بیٹھنے کی جگہ پر ہے درسگاہ آتا ہوں تو کتاب لانا بھول جاتا ہوں۔ طالبعلم نے کہا حضرت ایک کتاب درسگاہ میں بھی رکھ دیں کہ ہمیں سبق پڑھا سکیں۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ اردو کی شرح استاد بھی پڑھتا ہے اور طلباء بھی پڑھتے ہیں۔ استاد بھی محنت نہیں کرتا بس جانے سے ۱۰ منٹ پہلے ایک نگاہ دوڑائی اور جا کر وہاں اگل دیتا ہے، یہ نہایت مضر ہے اس فن کے ساتھ۔ جس کو آپ اس طرح اس کیفیت کے ساتھ

پڑھائیں گے تو میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ آپ کو اس سے مناسبت پیدا نہیں ہوگی۔ مناسبت دو باتوں سے پیدا ہوگی: (۱) اس کتاب کے محققین علماء نے جو شروح لکھی ہیں ان سے مطالعہ کرے۔ (۲) اس فن کے متقدمین کی کتابوں پر نظر ڈالے۔ حقیقت یہ ہے میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں ہمارے متاخرین نے ہر علم کو ایک پہیلی بنایا ہے جسے بوجھنا پڑتا ہے۔ متقدمین کے ہاں بہت سہولت ہے آپ متقدمین کی کتب پڑھیں گے بالکل سیدھی سادھی آسان عبارت ہے۔ مثلاً اصول الفقہ ہے آپ ملا بہاری کی **مسلّم الثبوت** اٹھا کر دیکھیں آپ جصّاص رازی کی کتاب **اصول الجصّاص** اٹھا کر دیکھیں (اب چھپ کر آ گئی ہے)، ملا بہاری کی کتاب اول سے آخر تک پڑھ جائیں آپ کو پتہ نہیں چلے گا کہ یہ علم الانشاء کی کتاب ہے، علم الریاضی کی کتاب ہے یا اصول الفقہ کی اِلّا یہ کہ آپ عقلیات کا کچھ ذوق رکھتے ہوں اور امام جصّاص کی کتاب اول سے آخر تک پڑھتے جائیں، تھوڑی سے استعداد بھی ہو تو آپ سمجھ جائیں گے کوئی بات اس میں مخفی نہیں تو غرض یہ کہ دو چیزوں سے استعداد پیدا ہوتی ہے ایک یہ کہ محققین علماء کی عربی شروح، عربی کی کتاب ہے تو عربی میں، فارسی کی کتاب ہے تو فارسی میں۔ دوسرا یہ کہ اسی فن کے متقدمین کی کتب پر نگاہ ڈال لیں تو اس علم اور فن کی حقیقت سمجھ میں آ جائے گی۔ یہ تو عام سی باتیں تھیں جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیں اس میں سے اکثر باتیں آپ کے علم میں ہوں گی۔

معلم کا خَلق اور خُلق:

سب سے بڑی بات یہ کہ معلم کے لئے سب سے مشکل مقام یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے لئے اسوۃ اور نمونہ ہے۔ ہمارے طلبہ ہمیں دیکھ کر وہ شکل وصورت اختیار کرتے ہیں جو ہماری ہوتی ہے۔ اساتذہ میں سے جو استاد زیادہ پسند ہوتا ہے اس کی چال ڈھال اختیار کرتے ہیں اس کا طریقہ تکلم اور شکل وصورت اختیار کرتے ہیں۔ اب خدانخواستہ اگر ہماری ڈھال شکل وصورت صحیح نہیں تو "**من سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا**" میں ہم آتے ہیں تو جب استاد طلبہ کے لئے اسوہ نمونہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کا خَلق اور خُلق شریعت کے مطابق ہو۔ استاد بالفرض اگر اسے پڑھانے میں کمی کوتاہی کرے یا فہم وافہام وتفہیم کے اندر، لیکن اگر اس کا عمل، اخلاق اور چال ڈھال شریعت کے

مطابق ہے تو طلبہ ایسے استاد کو زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت اس استاد کے جس کے کردار میں کمی ہو تو سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ استاد کا خَلق اور خُلق دونوں پیغمبر ﷺ کی شریعت کے مطابق ہوں۔

طلبہ میں عمل کا جذبہ ابھارنا:

تیسری چیز یہ ضروری ہے کہ طلبہ کو عمل پر ابھارنا، یہ نہیں کہ جس دن میں نے مطالعہ نہیں کیا اس دن میں وعظ کرتا رہوں، جہاں ضرورت ہے مثلاً آپ مسائل پڑھا رہے ہیں تو طلبہ میں یہ جذبہ ابھارنا کہ جو مسائل قابل عمل ہیں ان پر عمل کرنا ہے اور ہر مسئلہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ان سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہوا بظاہر آپ ﷺ کی صحبت اور خیر القرون برکتوں والا زمانہ میں انسان ایسے کام کرے۔ حضرت نے عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں کہ مسائل دو طرح کے تھے ایک مسائل وہ تھے جن پر عمل کر کے بتانا شان نبوت کے منافی نہیں تھا، نماز، روزہ، حج، اقیموا الصلوٰۃ، صلوا کما رایتمونی اصلی فرمایا، نماز پڑھ کر دکھادی۔ فرض علیکم الصیام، روزہ رکھ کر بتادیا، تعلموا مناسك الحج، حج کر کے دکھادیا۔ بعض مسائل ایسے تھے جس میں عملی تعلیم کی ضرورت تھی لیکن اس میں عملی تعلیم شانِ نبوت کے منافی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر بعض ایسے امور کا ارتکاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے کروادیا، یہ تو نہیں ہوسکتا تھا کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ رجم کی صورت خود کر کے بتلادیں یا اپنے آپ پر کرا کر بتلادیں۔ تو استاد جو مسائل قابل عمل ہوں وہ خود عمل کر کے بتلادے اور طلبہ سے بھی کہے کہ اس پر عمل کروایسا نہ ہو کہ رجم کا مسئلہ آپ نے بتلادیا اور کہہ دیا کہ اس پر عمل کرو! تو طلبہ میں عمل کا جذبہ ابھارنا اور ان کے اندر تعلق مع اللہ کی بنیاد رکھنا اللہ کی صحبت کا بیج ان کے دل میں بونا یہ چیز ایسی ہے کہ اگر یہ چیز استاد طلبہ کے دل میں پیدا کر سکے تو وہ سب سے کامیاب استاد ہے۔ طلبہ کے ساتھ سلوک مشفقانہ ہو ظالمانہ بھی نہ ہو اور بالکل دوستانہ بھی نہ ہو، یہ بھی طلبہ کے لئے مضر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ استاد خود اسوۂ اور نمونہ ہو، کوشش کرے کہ اس کی زندگی ایسی ہو کہ کسی مقام پر انگلی اٹھانے کی گنجائش نہ ہو کہ کوتاہی ہے اور چوتھی بات یہ کہ کتاب کی تسہیل کا خیال رکھا جائے، جس کا طریقہ میں نے عرض کردیا۔ پانچویں بات یہ کہ شاگرد

کے دل میں عمل کا جذبہ، تعلق مع اللہ، اللہ کی محبت کا جذبہ پیدا کرنا۔
کافی وقت گزر چکا، ختم بخاری کے سلسلے میں دو جگہ سے ہو کر آرہا ہوں، کافی تھکا ہوا بھی ہوں، یہ جو باتیں میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیں وہ ساری آپ کے علم میں ہوں گی کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے جو آپ کے علم میں نہ ہو البتہ و ذکر فان الذکری تنفع المؤمنین، کے تحت چونکہ ہم سب ایک ہیں اس لئے وہ باتیں میں نے آپ کی خدمت میں بے تکلفی سے پیش کر دیں۔ اللہ مجھے بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کو بھی۔ آمین

حضرت مولانا عبدالرؤف غزنوی صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۱ ستمبر بروز جمعرات ۲۰۰۳ء﴾

تدریس حدیث کے اصول وآداب

خطبہ مسنونہ کے بعد:

مجھے کل حضرت مولانا محمد عامر صاحب استاد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن نے بتایا کہ یہاں مدرسہ عثمانیہ میں ایک بہت قیمتی پروگرام کا انعقاد ہو رہا ہے۔ جس میں آپ کو بھی دعوت دی گئی ہے، اور مشورہ میں یہ طے ہوا ہے کہ آپ ''تدریس حدیث کے اصول وآداب'' سے متعلق بیان کرینگے مجھے افسوس بھی ہوا کہ قحط الرجال کا ایسا دور آیا کہ اتنے اہم موضوع پر مجھ جیسے ناچیز کو بات کرنے کی دعوت دی جارہی ہے، البتہ یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ جب ان مخلص حضرات کے مشورہ میں یہ بات طے ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ مدد فرمائینگے اور کچھ ایسی باتیں ذہن میں ڈال دینگے جو خود میرے لئے اور سامعین حضرات کے لئے مفید ہوں، لہذا میں اللہ کی توفیق سے اپنا مختصر بیان شروع کرتا ہوں جو کہ ایک تمہید اور گیارہ باتوں پر مشتمل ہے۔

تمہید یہ ہے کہ میں نے آپ حضرات کے سامنے ایک حدیث پڑھی ہے جو امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے اپنی سند کے ساتھ نبی ﷺ سے نقل کی ہے، اور یاد رکھنا چاہئے کہ یہ حدیث دارالعلوم دیوبند کے قواعد داخلہ سے متعلق چھپے ہوئے کتابچہ کے شروع میں بھی درج ہے، اور وہ حدیث یہ ہے:

اِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ وَاِنَّ رِجَالًا يَأْتُوْنَكُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ فَاِذَا اَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَيْرًا. اَوْ كما قال ﷺ

تو رسول اللہ ﷺ نے براہ راست تو صحابہ کرام کو اور صحابہ کے توسط سے پھر ہر وارث رسول کو جس کے پاس کتاب وسنت کا کوئی علم ہو یہ وصیت کی ہے کہ تمہارے پاس زمین کے کونے کونے سے لوگ آئینگے علم دین حاصل کرنے کے لئے۔ تو حضور ﷺ نے وصیت فرمائی کہ میری وصیت تم لوگوں کے لئے ان کے بارے میں خیر کی وصیت ہے۔ یعنی تم ان لوگوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَيْرًا وصیت قبول کیجئے ان کے سلسلہ میں خیر کی وصیت۔

تو استاذ کے ذہن میں ہمیشہ طالب علم کے لئے بھلائی ہونی چاہئے اس حدیث کی روشنی میں۔ میں نے حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے بارے میں اپنے اساتذہ سے بھی سنا ہے اور غالباً یہ چھپا ہوا بھی ہوگا حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے حالات میں، کہ حضرت فرماتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے جنت عطا فرمائی تو وہاں تو ماتشتھیہ الأنفس وتلذ الاعین سب کچھ ہے۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا چاہئے تو عرض کروں گا یا اللہ مجھے کچھ طلبہ دیجئے تا کہ میں ان کو پڑھاؤں۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے کافی گہری بات کی ہے۔ آپ حضرات بخاری شریف کی وہ حدیث جانتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جنت میں پہنچنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ وہ دوبارہ دنیا کی طرف چلا جائے شہید کے علاوہ، شہید شہادت کے اعلیٰ مقام کو دیکھ کر دوبارہ چاہے گا کہ وہ دنیا کی طرف چلا جائے اور شہادت کا مقام دوبارہ حاصل کرے۔ مذکورہ حدیث کو سامنے رکھ کر میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ حضرت کے فرمان کا مقصد یہ ہوگا کہ جنت میں پہنچنا یا جنت کی نعمتیں حاصل ہونا یہ بھی طلبہ کو پڑھانے کی برکت سے ہے تو وہ چاہیں گے کہ طلبہ کو بار بار پڑھائیں جیسا شہید چاہتا ہے کہ بار بار اس کو شہادت ملے۔

ایک بات اور جو دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب مدظلہ العالی سے ہم نے سنی ہے۔ ہم نے حضرت سے بخاری جلد اول پڑھی۔ حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابرین میں سے کسی کا مکاشفہ ہے، غالباً حضرت شاہ ولی اللہ کا یا کسی اور کا کہ انہوں نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک سے نور کے بے شمار شعلے تاروں کی شکل میں نکل رہے ہیں اور ہر تدریسِ حدیث سے تعلق رکھنے والے آدمی کے دل سے لگے ہوئے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر سے احادیث کا نور نکل کر وہ اساتذہ کرام جو حدیث پڑھانے والے ہیں ان تک یہ برکات پہنچ رہے ہیں اور ان کے توسط سے طلبہ تک تو بہرحال حدیث پڑھانا بہت ہی بڑا مقام ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اس تمہید کے بعد چند باتیں عرض کرونگا۔

پہلی بات حسنِ نیت:

''إنَّمَا الأعْمَالُ بِالنِّيَاتِ'' والی حدیث آپ حضرات کے سامنے ہے اور اکثر محدثین حضرات

جیسے امام بخاری نے اپنی کتاب میں اس حدیث کو سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ تو اساتذہ کرام طلبہ سے تو کہتے رہتے ہیں۔ حسن نیت۔ لیکن سب سے زیادہ اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور نبی ﷺ کے لائے ہوئے دین پھیلانے کی خاطر پڑھائیں۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک اور حدیث بھی پڑھانے والے کو زبانی یاد ہونی چاہئے اور ہمیشہ اس پر نگاہ رکھنی چاہئے اور بار بار اپنے دماغ میں دہرانا چاہئے اور میں تو یہ عرض کروں کہ جب بھی موقع ہو دوسروں کو بتانی بھی چاہئے۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی ایک عجیب قیمتی بات یہ ہے کہ میں جب بھی اپنے اندر کوئی کوتاہی دیکھتا ہوں تو اس سے متعلق کوئی وعظ دوسرے لوگوں کے سامنے کہہ دیتا ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے خود میری اصلاح فرماتے ہیں۔ تو یہ حدیث ہر حدیث پڑھانے والے کو یاد بھی رکھنی چاہئے اور جب بھی موقع ہو تو دوسروں کو بھی بتانا چاہئے تو اس طریقہ سے انشاء اللہ خود پر بھی اچھا اثر ہوگا۔ اور حدیث یہ ہے:

عَنْ أَبِي هريرة ﷺ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَيْهِ، رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اسْتُشْهِدْتُ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ جَرِيْءٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهُ وَقَرَأَ الْقُرْآنَ، فَأُتِيَ بِهِ، فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْآنَ، قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ عَالِمٌ، وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهِ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ: مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيْهَا إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ. [رواه مسلم

باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار، رقم:۴۹۲۳]

ویسے تو آپ حضرات جانتے ہیں لیکن پھر بھی اس حدیث کا خلاصہ پیش کر دیتا ہوں۔ قیامت کے دن سب سے پہلے جن کے بارے میں فیصلہ ہوگا حضور ﷺ نے تین آدمیوں کا نام لیا۔ نمبر ایک وہ آدمی ہے جو شہید ہوا ہوگا شہید کے بارے میں میں نے عرض کیا اس کو اتنا اونچا مقام دیا جائے گا کہ وہ جنت میں پہنچنے کے بعد بھی یہ چاہے گا کہ اس کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے اور بار بار یہ سعادت حاصل کرے لیکن اگر اس میں نیت صحیح نہ ہو تو آگے ذرا دیکھ لیجئے اس حدیث میں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا جو اس پر دنیا میں کی ہوں گی۔ وہ ان نعمتوں کا اقرار کرلے گا تو اللہ تعالیٰ کہے گا کہ ان نعمتوں کے بدلہ میں تو نے کیا کیا؟ تو وہ کہے گا کہ میں نے جہاد کیا آپ کے لئے، آپ کی رضا کے لئے یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے گا کہ جہاد تو تم نے کیا لیکن یہ جو تم کہہ رہے ہو "فیک" یہ غلط ہے، میرے لئے تم نے نہیں کیا۔ تو نے یہ سب اس لئے کیا کہ لوگ کہیں کیسا بہادر آدمی ہے تو تیرا مقصود حاصل ہو گیا، اب آخرت میں تمہیں کسی چیز کا حق نہیں ہے لہذا منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ دوسرا شخص جس کی مناسبت سے میں نے حدیث یہاں ذکر کی وہ شخص ہے جس نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو پڑھایا۔ اساتذہ کرام بھی اس میں آ گئے اور معلمین بھی اور معلمات بھی، اور جس نے قرآن پڑھا ہو، قرآن کا علم حاصل کیا ہو اس سے بھی یہی سوال ہوگا اور وہ بھی جواب دے گا کہ میں نے تو یہ کارنامہ انجام دیا کہ پڑھا اور پڑھایا اور ساتھ ساتھ یہ کہ آپ کے لئے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے وہ سب تم نے کیا۔ پڑھا بھی پڑھایا بھی، بہت سے لوگ عالم بن گئے اور آپ کو حضرت حضرت کہنے لگے لیکن تم نے میری وجہ سے یہ کام نہیں کیا۔ بلکہ یہ سب اس لئے کیا کہ لوگ کہیں بڑے عالم ہیں، اس سے کیا ہوگا نام حاصل ہوگا، لوگ ہدایا دیں گے، شہرت ہوگی، اخبارات میں نام آئے گا، لوگ دور دور ہمیں بلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ارادہ سے محفوظ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے وہ سب تم کو حاصل ہو گیا جس مقصد کے لئے علم حاصل کیا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا۔ اب اس آخرت میں تمہارے لئے کچھ نہیں اور پھر اس کو بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

یا الہ العالمین! اگر یہاں کوئی شخص بھی ایسا ہے جس کے دل میں کچھ بھی اخلاص ہے اس کے طفیل میں ہم سب کو حسن نیت عطا فرما اور اس ذلت سے محفوظ فرما جو اس دین کی وجہ سے قیامت کے دن ہمیں

ہوگی۔اس ذلت سے محفوظ فرما،حسن نیت عطا فرما۔علم کے کتنے فضائل آئے ہیں وہ آپ سب جانتے ہیں لیکن نیت صحیح نہ ہوتو یہ حشر ہوگا۔تیسرا شخص وہ ہے جس نے بہت مال خرچ کیا ہو دنیا میں، مدارس بنانے میں، جہاد کے راستے میں، غریبوں پر، مسکینوں پر، بیماروں پر، قسم قسم کے راستوں پر اپنا مال خرچ کیا ہوگا۔اس کے بھی بہت فضائل ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بھی یہی سوال کرے گا اور ان کی طرف سے یہی جواب ہوگا کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہے گا کہ ''فیک'' تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے لئے تم نے نہیں کیا، یہ تو تم نے اس وجہ سے کیا کہ لوگ تمہیں کہیں کہ بہت سخاوت والے آدمی ہیں۔تمہارا مقصد حاصل ہوا، اس کو بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔

دوسری بات حسن عمل:

حدیث پڑھانے والے کی نشست و برخاست، کھانے، پینے، ملنے جلنے، معاملات ہر چیز میں سنت کی اتباع ضروری ہونی چاہئے۔رسول اللہ ﷺ کی جو حدیثیں پڑھا رہے ہیں وہ ان کے عمل میں، زندگی میں بلکہ زندگی کے ہر ہر پہلو میں عملی طور پر موجود ہونی چاہئیں۔اگر خدانخواستہ ان پر عمل نہیں ہے تو نہ اس کے علم میں برکت ہوگی، نہ طلبہ کو آگے اس سے کسی قسم کا فائدہ حاصل ہوگا۔اسی طرح تواضع اور طلبہ کے ساتھ اچھا رویہ رکھنا یہ بھی مدرس کے لئے ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کا ایک واقعہ یاد آیا کہ تواضع کا کیا عالم تھا، طلبہ کے ساتھ کیا رویہ رکھتے تھے اور طلبہ کے ساتھ کتنی محبت کرتے تھے۔حضرت شیخ الاسلام کے بارے میں میں نے اپنے اساتذہ کرام سے سنا ہے کہ حضرت کی عادت تہجد کی تو تھی ہی۔تہجد کے بعد ذکر واذکار میں مشغول ہوجاتے (دارالعلوم میں اس وقت فلش کا انتظام تو نہیں تھا، سادہ بیت الخلاء ہوا کرتے تھے) حضرت کو دیکھا گیا (اپنے آپ کو چھپاتے بھی تھے) لیکن لوگوں نے دیکھا کہ اپنے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد اخیر میں طلبہ کے بیت الخلاء صاف کیا کرتے تھے۔حضرت ''شیخ العرب والعجم'' کے لقب سے صحیح معنوں میں ملقب بھی تھے، روضہ اقدس کے سامنے بھی کئی سال تک پڑھا چکے تھے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث تھے، استاذ الاساتذہ تھے، شیخ الوقت تھے اور عمر بھی اچھی خاصی تھی۔ان تمام چیزوں کے باوجود یہ کام کرنا تواضع کا کتنا اعلیٰ نمونہ ہے اور اخلاق کے بارے

میں آگے کیا کہہ سکتے ہیں۔ بعض اساتذہ اور ارباب انتظام کو جب پتہ چلا تو حضرت سے کہا بھی کہ حضرت آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، مدرسہ کی طرف سے انتظام موجود ہے تو فرمایا جب فرشتے طلبہ کے لئے پر بچھاتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے تو کیا حسین احمد فرشتوں سے بہتر ہے؟ اب حدیث پڑھانے والے کے اعمال اس طرح ہوں، تواضع اس طرح ہو، اخلاص اس طرح ہو، اس کے سامنے جو بیٹھنے والا ہوتا ہے وہ کچھ لئے بغیر نہیں جاسکتا۔ ایسے اساتذہ کے پاس پڑھنے والے جب نکلتے ہیں تو کچھ لے کر نکلتے ہیں، خالی ہاتھ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جائیں۔

میں نے عرض کیا کہ حدیث پڑھانے والے کے لئے دوسری چیز یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں اور سنتوں پر عمل ان کی زندگی میں نمایاں ہو۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا ایک واقعہ مجھے یاد آیا۔ آپ حضرات واقف ہوں گے کہ حنفی عالم ہیں، چند سال قبل انتقال ہوگیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

علامہ زاہد کوثری کے مخصوص شاگرد ہیں، ہمارے اکابرین سے بے انتہا تعلق رکھتے تھے، ہمارے اکابرین کی کتابوں پر ان کی تعلیقات ہیں، مقدمات ہیں۔ حضرت بنوری علیہ الرحمۃ سے اجازت حدیث لی ہے اور ان کو اپنے اکابرین میں شمار کرتے ہیں اور ہمارے بہت سے اکابرین نے ان سے اجازت لی ہے۔ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم، حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کو اپنے اساتذہ میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب کا بھی ان سے گہرا تعلق رہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں جب بھی وہ تشریف لاتے تو حضرت قاری طیب صاحب علیہ الرحمۃ اساتذہ کو حکم فرماتے کہ اساتذہ ان سے استفادہ کریں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس سعادت سے نوازا کہ جب میں جامعۃ الملک سعود میں پڑھ رہا تھا تو حضرت وہاں پر استاد تھے، حضرت سے کچھ استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ میں حضرت کا طلبہ کے ساتھ رویہ کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جامعۃ الملک سعود بہت بڑا جامعہ ہے۔ وہاں صرف دینی علوم پڑھانے کا نہیں بلکہ ڈاکٹری وغیرہ دوسرے شعبے بھی موجود ہیں، تو وہاں دوسرے طلبہ بھی ہوتے تھے اور اسلامیات سے متعلق شعبہ کے طلبہ بھی ہوتے تھے۔ شیخ کو تو اللہ نے ایک مقام دیا تھا اکثر طلبہ ان کو جانتے تھے۔ میں ایک مرتبہ شیخ کے ساتھ تھا جیسے وہ منظر بالکل میرے سامنے ہے۔ وہ تشریف لے جارہے تھے کتب خانہ سے درس گاہ کی طرف یا درس گاہ سے کتب خانہ کی طرف اور طلبہ کی اچھی خاصی تعداد ادھر سے آرہی تھی، آنے جانے کا راستہ الگ تھا لیکن بیچ میں کوئی رکاوٹ نہیں

تھی۔ میں نے دیکھا کہ جب آنے والے حضرت کو دیکھتے، عمر بھی اس وقت اچھی خاصی ستر کے آس پاس تھی، یہ ۸۸ و یا ۸۹ء کی بات ہے، تو ادھر سے آنے والے جب شیخ کو دیکھتے اور یہ ارادہ کرتے کہ شیخ سے ملاقات کریں اور شیخ کی طرف مڑیں تو میں دیکھتا تھا اس سے قبل کہ وہ مڑیں شیخ مڑ جاتے تھے اور ان کی طرف مصافحہ کرنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ میں حیران بھی ہو جاتا کہ اتنے طلبہ اور شیخ کی یہ عمر۔ میں نے کہا کہ یہ جو اخلاق ہیں اور یہ جو صحیح معنوں میں شفقت ہے اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ برکات منتقل فرماتے ہیں۔

تو حسن عمل اور تواضع یہ حدیث پڑھانے والے کے لئے دوسرے نمبر پر بہت ضروری ہے۔

اس کے علاوہ جماعت کا اہتمام۔ خدانخواستہ کسی مدرسہ میں ایک استاد حدیث پڑھاتا ہے (میرا موضوع صرف حدیث کے بارے میں ہے ورنہ یہ ہر پڑھانے والے کے لئے ہے) حدیث پڑھانے والے استاد ہیں اب خدانخواستہ اگر وہ فجر کی نماز میں نہیں ہوتے۔ ایک دن تو طلبہ کہیں گے کہ حضرت کہیں تشریف لے گئے ہونگے (اللہ کی مسئولیت تو اصل درجہ کی ہے میں یہ تربیت کے حساب سے کہتا ہوں) دوسرے دن بھی نہیں ہیں، تیسرے دن بھی نہیں۔ بعد میں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ آٹھ نو بجے وہ اپنے گھر سے باہر آتے ہیں تو اب آخر حسن ظن کب تک؟ تاویلیں کب تک؟ اگر خدانخواستہ استاد اس قسم کی بنیادی چیزوں کی پابندی نہیں کرتا تو طلبہ پر غیر شعوری طور پر منفی اثر پڑ سکتا ہے اور ان کی تربیت متاثر ہو سکتی ہے۔

تیسری بات حسنِ تربیت:

حدیث پڑھانے والے استاذ کے لئے خاص طور پر ضروری ہے کہ تربیت پر توجہ دے، مثال کے طور پر ان کے سامنے توکل والی حدیث آئی تو رسول اللہ ﷺ کی توکل سے متعلق مزید حدیثوں کو ذکر کیجئے، صحابہ کرام کے واقعات کو ذکر کیجئے۔ موجودہ زمانہ پر آیئے، طالب علم ہوتے ہوئے ایسا نہ ہو کہ ٹیوشن پڑھا رہے ہیں۔ یہ توکل کے خلاف ہے، یا کسی کے پاس موبائل فون دیکھا تو سوچا کہ میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں لہذا ٹیوشن پڑھا کر میں بھی موبائل حاصل کرلوں، کسی کے پاس موٹر سائیکل دیکھی تو سوچا کہ میرے پاس تو ہے نہیں تو اس کو حاصل کرنے کے لئے میں ٹیوشن پڑھاؤں یا کوئی اور راستہ

اپناؤں۔ آپ توکل والی حدیث کو سامنے رکھ کر اس قسم کی تربیت کریں اور یہ تمام چیزیں آپ کی نظر میں ہونی چاہئے اس حدیث کا ظاہری مطلب بیان کر کے اس سے فوری طور پر آگے نہ نکلنا چاہئے۔ تو یہ حسن تربیت کے متعلق چند باتیں تھیں۔ میں صرف مثالیں دیتا ہوں کیونکہ وقت مختصر ہے، زیادہ تفصیل اور تشریح کی ضرورت نہیں۔

چوتھی بات حسنِ تدریس:

حسن نیت، حسن عمل، حسن تربیت کے بعد حسن تدریس بھی نہایت ضروری ہے۔ خدانخواستہ اگر آپ صرف فضائل کی باتیں کرتے رہے تو طلبہ کسی کو بخشتے نہیں ہیں، اخیر میں طلبہ میں یہ مشہور ہوگا ''یہ تو سبق نہیں پڑھاتے وعظ کرتے ہیں'' ۔طلبہ کا اصل مقصود تو علم حاصل کرنا ہے اس کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ہے، لیکن یہ علم کو بہت زیادہ پیش نظر رکھتے ہیں تو صرف فضائل بیان کرنا یا جو حدیثیں میں نے ذکر کیں ان پر زیادہ زور دینا اور جو احکام سے متعلق حدیثیں ہیں یا علمی حدیثیں ہیں ان پر زیادہ توجہ نہ دینا یہ بھی مدرس کی کامیابی نہیں ہے۔

لہذا چوتھی چیز حسن تدریس ہے یعنی تدریس کے لئے بہت اچھے طریقہ سے تیاری کرنا ور اچھی طرح ترتیب سے پڑھانا۔ میں جب دارالعلوم دیوبند میں پہلی ہی بار اکابرین کے حکم سے تدریس پر مامور ہوا تو حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری جو کہ میرے استاذ ہیں اور الحمد للہ بقید حیات ہیں، تو میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضرت کچھ فرمادیجئے، پڑھانے کا سلسلہ ہے اکابرین کے حکم سے، اور میں نے طالبعلمی کے زمانہ میں جو تکرار کراتے ہیں وہ بھی کبھی نہیں کرایا تو حضرت کچھ پڑھانے سے متعلق راہنمائی فرمادیجئے۔ حضرت نے بہت سی باتیں بتائیں منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی تھی کہ جو آپ پڑھائینگے آپ مطالعہ کر کے صرف فہم پر اکتفا نہ کیجئے کہ آپ نے وہ سبق سمجھ لیا، اچھی طرح شروحات بھی دیکھ لیں اور جو کچھ اعتراضات وغیرہ ہیں وہ بھی سمجھ چکے اور ان کے جوابات بھی سمجھ میں آگئے اور کوئی اشکال باقی نہیں رہا بلکہ اس مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ ہے۔ اپنے ذہن میں ان کو ترتیب دے کر طلبہ جو خالی الذہن ہوں ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر ترقیم **من الادنی الی الاعلی** کی طرز پر چلنا ہے یعنی فہم پر اکتفا نہیں کرنا بلکہ تفہیم کی طرف آنا ہے یعنی میں طلبہ کو کہاں

سے بات شروع کر کے بتاؤں۔تو یہ ضروری ہے پڑھانے والے کے لئے خصوصاً حدیث پڑھانے والے کے لئے، جب وہ تیاری کرلے، مطالعہ کرلے دوسرے نمبر پر وہ تمام باتیں کتاب بالکل بند کر کے۔ باتیں تو ان کو یاد ہیں۔ان کو ترتیب دیدیں اور اس کام میں شروع میں تو وقت کچھ زیادہ لگتا ہے لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا تعاون ہوتا ہے کہ بہت ہی کم وقت میں آدمی اپنے سبق کو ایسی ترتیب دیدیتا ہے کہ مجھے کہاں سے بات شروع کرنی ہے، کس بات کو پہلے ذکر کرنا ہے کس بات کو بعد میں ذکر کرنا ہے اور کس انداز سے بات کرنی ہے تاکہ طلبہ کے سامنے اچھے طریقہ سے مقصود واضح ہوجائے کیونکہ وہ خالی الذہن ہوتے ہیں اس کو کہیں گے حسن تدریس۔

پانچویں بات احادیث کے درمیان تطبیق کرنا:

حدیث پڑھانے والے کے لئے ہر مسئلہ سے متعلق جو احادیث ہوں ان کے درمیان تطبیق کی کوشش کرنی چاہئے اور دوسری تعبیر یہ ہے کہ ترجیح سے زیادہ تطبیق پر محنت کرنی چاہئے، اور اگر میں یہ عرض کروں کہ یہ دیوبندیت کی خصوصیت ہے اور دیوبندیت کے معنی ہے حنفی مذہب کی صحیح ترجمانی۔ دارالعلوم دیوبند کے اکابرین کی خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلہ میں جو حدیث یا احادیث ہوں تو وہ صرف بخاری یا مسلم کی حدیثوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس مسئلہ کے متعلق جتنی حدیثیں جس کتاب میں بھی ہوں ان سب کو سامنے رکھ کر ان میں جو اعلیٰ درجہ کی صحیح ہیں ان کو بھی سامنے رکھتے ہیں، جو صحت میں ان کے بعد کے درجے کی ہیں ان کو بھی سامنے رکھتے ہیں، حسن کو بھی سامنے رکھتے ہیں لذاتہ ہو یا لغیرہ ہو، ہاں جو بالکل ایسی ضعیف ہوں جو کہ فضائل اعمال میں بھی قابل استدلال نہ ہوں صرف ان کو تو چھوڑ دیتے ہیں، جو کہیں بھی کارآمد ہوں ایسی تمام حدیثوں کو سامنے رکھتے ہیں۔اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ترجیح کے بجائے تطبیق دیں اور یہ حنفیت کی خصوصیت ہے اور حنفیت کی صحیح ترجمانی دیوبندیت کی خصوصیت ہے کیونکہ ہمارے اکابر ہمیشہ ترجیح سے زیادہ تطبیق کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے ایک حدیث جو صحیحین میں موجود نہیں ہے دوسری کتابوں میں موجود ہے اور صحیح اگرچہ نہیں ہے حسن ہے، آپ خود کہتے ہیں کہ دوسرے مسائل میں تو وہ قابل اعتبار ہے اور یہاں پر آپ نے چھوڑ دیا، کیوں چھوڑا؟ آپ کوشش کریں کہ اس پر بھی عمل ہو۔دوسرے حضرات کے مقابلہ میں احناف کو جو اللہ تعالیٰ

نے مقام دیا ہے اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ وہ کوشش یہی کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تمام حدیثوں پر عمل ہو جائے۔ اور اس کے لئے مدرس کے لئے ضروری ہے کہ جو ان کے زیرِ درس کتاب ہے صرف اس پر اکتفا نہ کریں، اس موضوع سے متعلق باقی جو حدیث کی کتابیں ہوں ان کو ضرور سامنے رکھیں اور کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں۔

اس سے متعلق ایک مثال اس وقت میرے ذہن میں آئی وہ میں عرض کر دیتا ہوں تاکہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ حضرات دیوبند جو کہ ترجمان ہیں احناف کے وہ کس طرح ترجیح کے بجائے تطبیق پر عمل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فجر کے وقت کا مسئلہ ہے، فجر کی نماز کس وقت پڑھی جائے؟ بخاری شریف اور مسلم شریف میں غلس سے متعلق احادیث میں امام بخاری نے تو ابواب بھی منعقد کئے ہیں اور حدیثیں بھی ہیں۔ مسلم میں بھی حدیثیں ہیں اور بخاری میں بھی ہیں کہ فجر کی نماز کا صحیح وقت غلس ہے اور دیگر ائمہ نے اس کو اختیار بھی کیا ہے احناف نے اس مسئلہ سے متعلق تمام احادیث کو سامنے رکھا کہ صرف بخاری اور مسلم میں اسفار کا ذکر نہیں ہے لیکن ترمذی وغیرہ میں اسفار کی حدیث موجود ہے'' اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر '' یہ حدیث ترمذی میں صفحہ ۴۰ جلد اول پر موجود ہے۔ امام ترمذی نے آگے یہ بھی فرمایا ہے ھذا حدیث حسن صحیح۔ ابوداؤد میں بھی موجود ہے غالباً صفحہ ۶۴ پر ہے۔ نسائی میں بھی موجود ہے، صحیح ابن حبان میں بھی موجود ہے، طبرانی میں بھی موجود ہے، دارمی میں بھی موجود ہے اور ترمذی کا فیصلہ میں نے سنا دیا ھذا حدیث حسن صحیح۔ تو کیا اس کو اس وجہ سے بالکل نظر انداز کر دیا جائے کہ یہ حدیث بخاری میں موجود نہیں اور ترجیح بخاری کی حدیث کو دی جائے کہ بخاری میں جو ہے وہ زیادہ قوی ہے، یا اگر تطبیق کی صورت بن جائے وہ زیادہ بہتر ہے؟ تاکہ دونوں پر عمل ہو تو ہمارے اکابرین کہتے ہیں کہ دونوں پر عمل ہو۔ غلس والی پر بھی اور اس پر بھی۔ کس طرح؟ انہوں نے مافی الباب بلکہ مافی الأبواب احادیث کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جماعت کی نماز میں ایک اہم چیز تکثیر جماعت ہے ویسے تو ہر عمل میں تکثیر بہتر ہے لیکن جماعت کی نماز میں شریعت نے اس کا خیال رکھا ہے کہ تکثیر جماعت کی رعایت ہونی چاہئے۔ تو اب تکثیر جماعت غلس میں ہے یا اسفار میں ہے؟ تو دیکھنا چاہئے کہ جس میں تکثیر جماعت ہو، جس میں لوگ زیادہ آسکیں اسی پر عمل ہونا چاہئے۔ اگر غلس میں لوگ

زیادہ آسکتے ہیں تو نماز غلس میں پڑھنی چاہئے اور اگر اسفار میں زیادہ ہوں تو اسفار میں پڑھنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تقریباً سو فیصد لوگ تہجد گزار تھے تہجد پڑھنے والے کے لئے آسانی یہی ہے کہ نماز غلس میں پڑھی جائے تا کہ سب لوگ شریک ہو سکے، انتظار کی صورت میں نیند کا غلبہ ہوسکتا ہے تو رسول اللہ ﷺ کا عمل اور صحابہ کا عمل یہی غلس کا تھا۔ یہ جو تاویل ہے کہ غلس میں شروع کرنا اسفار میں ختم کرنا یا پھر اور عجیب عجیب تاویلیں بعض حضرات کرتے ہیں کہ مسجد میں کیونکہ چھت ذرا نیچے تھی لوگ نظر نہیں آ رہے تھے یہ تمام تاویلیں بے جا ہیں۔ اس لئے کہ غلس کا جو ذکر ہے تو رسول اللہ ﷺ کی نماز ختم ہونے کے بعد ہی غلس کا ذکر ہے تو کیونکہ تکثیر جماعت اسی میں تھی تو اسی پر عمل ہونا چاہئے تھا۔ ہمارے اکابرین نے یہی کہا ہے کہ اگر کوئی ایسی صورت حال بن جائے تو غلس ہی میں پڑھنا بہتر ہے اور وہ حدیث اسی حالت پر محمول ہے۔ چنانچہ رمضان المبارک میں آٹو میٹک صحابہ کا دور بن جاتا ہے۔ البتہ وہ تہجد کے لئے اٹھتے تھے ہم کھانے کے لئے اٹھتے ہیں لیکن صورت وہی بن جاتی ہے تو ہر آدمی کے لئے آسانی اسی میں ہے کیونکہ تکثیر جماعت اس میں ہے کہ شروع میں نماز پڑھی جائے تو ہمارے ہی اکابرین کا رمضان میں غلس پر عمل ہے۔ اگر غلس والی حدیث پر وہ عمل نہ کرتے تو رمضان المبارک میں بھی غلس میں نماز نہ پڑھتے اور اسفار کا انتظار کرتے۔ اور اگر وہ صورتحال نہ ہو جیسے کہ تہجد میں نہ اٹھنے کی عام حالت آج کل ہے تو ایسی صورت میں تکثیر جماعت اسفار میں ہے۔ اسفار والی حدیث پر بھی عمل ہو جائے اور اگلا حصہ اس کی دلیل بھی ہے "فانہ اعظم للاجر" اور "اعظم للاجر" اسی وجہ سے کہ جتنی تکثیر جماعت ہو اتنا ہی زیادہ ثواب ہے۔ یہ میں نے ایک مثال پیش کی حاصل اس کا یہی ہے کہ ہمارے اکابرین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ما فی الباب جتنی احادیث ہیں ان کے درمیان تطبیق کی صورت ہو بجائے ترجیح کے۔ یہ ایک مثال میں نے پیش کی ایسی بیشمار مثالیں اور بھی ہیں۔

چھٹی بات مقدارِ سبق میں اعتدال:

حدیث پڑھانے والے کو ابتداء، وسط اور انتہاء کا خیال رکھنا چاہئے۔ اپنی کتاب کو سامنے رکھ کر پہلے ہی یہ طے کر لینا چاہئے کہ مجھے کس طرح کتنی مقدار پڑھانی ہے۔ ہمارے ہاں جو ایک بہت بڑی

پریشان کن مسئلہ ہے۔ آپ حضرات جانتے ہیں اور شیخ ابوغدۃ علیہ الرحمۃ کا میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا تھا، یہ جس وقت میں ان کے پاس پڑھتا تھا اس وقت کی بات نہیں ہے اس کے بعد میں دوبارہ ایک مرتبہ گیا تھا اور میری آخری ملاقات حضرت شیخ سے ہوئی ریاض میں ان کے گھر پر وہ تاریخ بھی میرے پاس درج ہے ڈائری میں۔ حضرت سے چونکہ میں نے پڑھا تھا تو میں نے حدیث کی اجازت طلب کی تو حضرت نے تحریری طور پر لکھ دی اور ایک زبانی نصیحت نہایت ہی تاکید سے کی فرمایا کہ مجھے اس سے سخت تکلیف ہے کہ برصغیر کے مدارس میں ایک عادت ہے کہ سال کے شروع میں بہت زیادہ لمبی تقریریں کرتے ہیں اور سال کے آخر میں حدیثوں کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ اس کی تلاوت بھی صحیح ادائیگی کے ساتھ نہیں ہوتی فرمایا کہ مجھے کسی طریقے سے بھی یہ پسند نہیں ہے کہ احادیث کو اس طرح پڑھا جائے۔ تو حدیث پڑھانے والے کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ شروع سے اس انداز سے چلے کہ اخیر تک اعتدال باقی رہے یہ بات ٹھیک ہے کہ نصاب بہت زیادہ ہے لیکن اگر استاد پابندی سے اور اعتدال کو مدنظر رکھ کر پڑھائیں تو نصاب بھی مکمل ہو سکتا ہے اور افہام وتفہیم میں بھی آسانی ہو سکتی ہے۔ بہر صورت یہ موجودہ طریقہ کہ سال کے شروع میں تو بہت ہی لمبی تقریر ہو اور سال کے آخر میں احادیث کی اس طرح تلاوت ہو کہ تلاوت بھی صحیح طریقے سے نہ ہو پائے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کے ساتھ واقعی ناانصافی ہے۔ اس لئے اس پر غور کرنا چاہئے اور ایک صحیح مقدار کو لے کر چلنا چاہئے۔

ساتویں بات اکابرین کا احترام:

حدیث پڑھانے والے استاذ مختلف ائمہ کرام کے مذاہب و آراء اور ان کی دلائل بیان کرتے رہتے ہیں اور مذہب راجح کی طرف سے باقی ائمہ کے جوابات بھی بیان کرتے رہتے ہیں یہاں پر شیطان آ کر۔ شیطان تو ہر جگہ کام کرتا ہے۔ خدانخواستہ کسی کی زبان سے کوئی ایسی بات نکلوا دے کہ جو ہمارے ائمہ کی شان میں گستاخی یا بے ادبی کی بات ہو، یہ علم کے لئے اور طلبہ کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ طلبہ کے اندر استاد کی باتیں خود بخود منتقل ہوتی ہیں۔ جب وہ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ اساتذہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے بارے میں یہ کہتے ہیں تو وہ بے ادبی اور اکابرین کی شان میں گستاخی کے خود بخود عادی بن جاتے ہیں۔ اس پر حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ کا بھی ایک واقعہ ہے اور میں نے اپنے

اساتذہ کرام سے حضرت شیخ الہند کے بارے میں بھی سنا ہے کہ ایک مرتبہ وہ پڑھا رہے تھے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل بیان کیے تو طالبعلموں میں سے کسی نے یہ کہا کہ حضرت آپ نے ایسے دلائل بیان کیے ہیں کہ اگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ زندہ ہوتے تو شاید وہ رجوع فرمالیتے اپنی بات سے یا اپنے مذہب سے۔تو حضرت کو بہت سخت ناگوار ہوا۔ شیخ الہند کے بارے میں تو میں نے حضرت مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ سے یہ سنا جو حضرت شیخ الہند کا حوالہ دے رہے تھے کہ وہ کتاب بند کر کے زیادہ غصے کی وجہ سے گھر چلے گئے اور پھر اگلے دن جو آئے تو اس مسئلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اُسی مسئلہ میں ایسے دلائل بیان کئے کہ سب حیران رہ گئے۔اور پھر فرمایا: تمھیں ان ائمہ کا پتہ نہیں انہوں نے کتنی قربانیاں دیں، اللہ کے ہاں ان کا کتنا بڑا مقام ہوگا، اگر یہ زندہ ہوتے تو مجھ جیسا آدمی ان کے سامنے بات کرتا؟ میں تو ان کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہ ہوتا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں بھی ان کا مقلد ہوتا۔

جو دلائل ہمارے اکابرین نے بیان کئے وہ تو بیان کرنے چاہئیں لیکن ائمہ کی شان میں اور اکابرین کی شان میں کوئی ایسا جملہ نہ کہنا چاہئے جو خدانخواستہ پڑھانے والے کے لئے علم کی محرومی کا سبب ہو یا جو سننے والے طلبہ جو کہ خالی الذہن ہیں ان کی تربیت پر اس سے غلط اثر پڑے۔ یہ ساتویں چیز تھی۔

آٹھویں بات معاصر علماء کی تنقیص سے اجتناب:

حدیث پڑھانے والے کی ایک خامی یہ بھی ہوتی ہے کہ کبھی خدانخواستہ طلبہ کے سامنے اپنے معاصرین اساتذہ کے بارے میں کوئی تنقیص کی بات بیان کردے اور یہ چیز خواتین معلمات میں شاید زیادہ ہو۔ مجھے اس کا تو پتہ نہیں، لیکن صرف حدیث کی روشنی میں بیان کرتا ہوں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تکثرن اللعن کہ شاید ان میں بھی زیادہ ہو اور پڑھانے والوں میں بھی بعضوں میں یہ ہوتا ہے۔ مقصد تو دین پڑھانا ہے، دین پہنچانا ہے۔میں نے ابھی بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے قلبِ اطہر سے نور کے شعلے نکلے ہوئے ہیں اور پڑھانے والے تک وہ گئے ہیں تو اگر آپ دوسرے پڑھانے والے کی برائی یا ان کی تنقیص بیان کرتے ہیں تو وہ جو نور کا شعلہ آرہا ہے خدانخواستہ وہ راستہ بند نہ ہو جائے۔

اپنے معاصرین اساتذہ کے بارے میں کوئی برائی بیان کرنا یا کوئی ایسا کلمہ کہنا یا کسی طرح کوشش کرنا کہ طلبہ میری تو زیادہ تعریف کریں اور ان کی تنقیص سامنے آجائے تو یہ حسن نیت کے بھی خلاف ہے اور یہ میں عرض کروں میرا اپنا بھی کچھ عرصہ گزرا ہے تجربہ ہوا ہے اور اپنے اساتذہ کرام سے بھی سنا ہے کہ بعض طلبہ کی یہ عادت ہوتی ہے کہ استاد سے اس طرح پیش آتے ہیں جیسے کہ ان کا ہی مخصوص شاگرد ہے اور استاد کی باتیں سن کر پھر دوسرے استاد کے مقرب بننے کے لئے وہ باتیں ان تک پہنچاتے ہیں جس سے اساتذہ کے درمیان ایک محاذ قائم ہو جاتا ہے لہذا کسی بھی طالب علم کے سامنے اپنے حریف اساتذہ کی کوئی بات جس میں ان کی تنقیص ہو بیان نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ یہ غیبت کے ساتھ ساتھ محاذ آرائی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ علم کے لئے ایک رکاوٹ ہے، یہ کسی طرح بھی نہ ہونا چاہئے بلکہ کوشش یہ کرنی چاہئے کہ جو معاصرین اساتذہ ہیں، ان کی اچھی تصویر اپنے طلبہ کے سامنے پیش کرے، اس لئے کہ آپ کے یہ اعمال پھر طلبہ اپنائیں گے۔

پھر مجھے یاد آیا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ ریاض میں جامعۃ الملک السعود میں تخریج کا مادہ پڑھا رہے تھے تو مجھے یاد ہے کہ ایک دن دکتور محمود الطحان کی کتاب **اصول التخریج ودراسۃ الاسانید** کا نام آیا تو طلبہ سے کہا کہ یہ کتاب ضرور خرید لی جائے، یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے اور دکتور محمود طحان کی بہت تعریف بھی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید دکتور محمود طحان یہ شیخ ابوغدہ کے استاد ہونگے اتنی تعریف کی اس طرح تعریف کی۔ کچھ عرصہ بعد میرا جانا ہوا کویت، وہ جامعۃ الکویت میں پڑھاتے تھے غالباً اب بھی پڑھاتے ہونگے تو میری خواہش ہوئی کہ میں محمود الطحان **بارك اللہ فی حیاتہ وفی عمرہ** سے ملاقات کروں کیونکہ ان کی کتابیں بھی بہت ہیں اور میں نے شیخ سے ان کی تعریف بھی بہت سنی تھی تو میں نے ان سے ملاقات کی بہت ہی اکرام سے ملے تو میں نے شیخ ابو غدہ کا نام ان سے ذکر کیا۔ کہا کہ شیخ ابوغدہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے اس وجہ سے میرے دل میں خواہش تھی کہ میں آپ سے ملاقات کروں، ان کی چند کتابوں کا میں نے نام بھی لیا کہ وہ میں نے پڑھی ہیں اور بہت ہی خوشی ہوئی ہے۔ تو انہوں نے عربی زبان میں کہا **فضیلۃ الشیخ عبد الفتاح ابو غدۃ شیخی وقد درست عندہ، وھو اکبر منی بعشر سنوات**۔ کہا کہ وہ میرے استاد ہیں

میں نے ان سے پڑھا ہے اور وہ مجھ سے دس سال بڑے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ شیخ اس طرح ان کا نام لیتے تھے کہ مجھے لگتا تھا کہ شاید دکتور محمود الطحان ان کے استاد ہیں اور پتہ یہ چلا کہ نہیں شیخ ابو غدہ ان کے استاد ہیں۔ تو عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے حضرات اساتذہ کے ساتھ مدرس کا خصوصاً حدیث پڑھانے والے کا معاملہ اس طرح ہونا چاہئے۔

نویں بات طلبہ کو سوال کی ترغیب دینا:

استاد کی کوشش ہونی چاہئے کہ طلبہ ان سے سوالات کریں ایسا نہ ہو کہ طالب علم نے سوال کیا اور استاذ کو غصہ آیا۔

دسویں بات بوقت ضرورت اپنی بات سے رجوع کرنا:

کسی اپنی بات پر ڈٹ جانا یہ حدیث پڑھانے والے کو زیب نہیں دیتا۔ استاد سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ کبھی کوئی مسئلہ پیش آیا، بعد میں پتہ چلا کہ وہ اس طرح نہیں ہے یا طالب علم نے اعتراض کیا اور معلوم ہوا کہ استاد کی بات صحیح نہیں تھی تو استاذ کو رجوع کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں ہمارے اکابرین کے واقعات ہیں لیکن وہ واقعات عرض کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔

گیارہویں بات اصول حدیث پر نظر:

حدیث پڑھانے والے استاد کے لئے ضروری ہے کہ اصول حدیث پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنے طلبہ کو عملی مشق کراتے رہے، سند و متن سے متعلق اصول و قواعد کی اہمیت طلبہ کے ذہنوں میں بٹھادے، صرف ائمہ کا مذاہب بیان کرنا اور ان کی دلیلیں طلبہ کو یاد کرانے سے احادیث کا حق ادا نہیں ہوتا، اسی اہمیت کے پیش نظر امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب "السنن للترمذی" سے متعلق اصول و قواعد پر مشتمل رسالہ "کتاب العلل" کو اپنی کتاب کا جزء بنادیا، وقت مختصر ہے، اصول الحدیث کی چند اہم کتب و رسائل کا ذکر کرتا ہوں جن کا مطالعہ کرنا اور اپنے طلبہ کو ان سے روشناس کرانا حدیث پڑھانے والے استاد کے لئے ضروری ہے۔

امام ترمذی کی "کتاب العلل" کا ذکر کر چکا ہوں اس کے بعد سب سے پہلا مستقل رسالہ جو اس

فن میں لکھا گیا ہے وہ ''المحدث الفاصل'' حسن بن خلاد رامہرمزی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اس کے بعد ابوعبداللہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''علوم الحدیث'' ہے، پھر خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اصول حدیث سے متعلق کافی چھوٹے چھوٹے رسائل لکھے ہیں البتہ ان کی دو کتابیں زیادہ مفصل اور دستیاب ہیں ایک ''الکفایہ فی علم الروایہ'' اور دوسری ''الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع'' ہے، خطیب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سب سے اہم اور مرتب کام ابوعمرو بن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ نے کیا، انہوں نے خطیب کی کتابوں اور مسائل کا نچوڑ بہترین ترتیب کے ساتھ اپنی کتاب ''علوم الحدیث'' جو ''مقدمہ ابن الصلاح'' کے نام سے مشہور ہے پیش کیا، ان کی کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کے بعد جتنی کتابیں اصول حدیث میں لکھی گئی ہیں ان سب کا براہِ راست یا بالواسطہ ''مقدمہ ابن الصلاح'' سے تعلق ہے۔

چنانچہ حافظ زین الدین عراقی نے اس کی شرح لکھی ''التقیید والایضاح'' کے نام سے جو کہ نہایت اہم کتاب ہے، اسی طرح انہوں نے ''مقدمہ ابن الصلاح'' کا خلاصہ اشعار میں پیش کر کے ایک اور رسالہ ''الفیۃ الحدیث'' کے نام سے لکھا جس کی شرح امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح المغیث'' کے نام سے لکھی، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اختصار دو الگ الگ رسالوں میں پیش کیا ایک کا نام ''الإرشاد'' ہے اور دوسرے کا نام ''التقریب'' ہے جس کی شرح جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تدریب الراوی'' کے نام سے لکھی ہے اور نہایت مفید شرح ہے، آخر میں عصر حاضر کے نامور محدث الدکتور محمود الطحان زید مجدھم نے مذکورہ کتابوں کا خلاصہ ایک سہل انداز میں اپنے رسالہ ''تیسیر مصطلح الحدیث'' میں پیش کیا، استاد کو چاہئے کہ اپنے طلبہ کو اس رسالہ کے مطالعہ کی تائید فرمائیں، حافظ ابن حجر کا ''نخبہ اور اس کی شرح ''نزھۃ النظر'' سے تو ہر استاد وطالب علم واقف ہے اس لئے کہ وہ نصاب میں شامل ہے، بہرصورت مندرجہ بالا کتابوں پر نظر اور ان کا مطالعہ حدیث پڑھانے والے استاذ کے لئے ضروری ہے۔

یہ گیارہ باتیں ''احد عشر کوکباً'' اپنی بساط کے مطابق آپ کے سامنے میں نے پیش کی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو مفید بنادیں۔ آمین

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۳ مئی ۲۰۱۰ء بروز جمعرات ساڑھے چار بجے سہ پہر﴾

الحمدللّٰہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد! اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ لقد منّ اللّٰہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبین۔ وقال رسول اللّٰہ ﷺ انما بعثت معلماً۔ وقال: العلماء ورثۃ الانبیاء وانما الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما انما ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافرٍ۔

حضرات علماء کرام آپ مختلف علماء کے بیانات سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔اللہ تبارک وتعالیٰ اس استفادہ کو آپ کے لئے خیر اور فلاح کا ذریعہ بنائے۔مجھے مکلّف کیا گیا ہے کہ میں آپ کے سامنے کچھ گزارشات پیش کروں۔تو بحیثیت معلم اور مدرس میں اپنے تجربات کی روشنی میں بعض امور آپ کے سامنے پیش کروں گا۔اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے اچھی نیت کے ساتھ ان باتوں کو کہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔اور پھر اس کا فائدہ مجھے اور آپ کو عطا ہو۔

جہاں تک تعلق ہے معلم کے فرائض کا اور اس کی ذمہ داریوں کا تو اس سلسلے میں ایک بات تو میں اپنے تجربے کی بنا پر آپ سے یہ عرض کروں گا کہ

جو طلبہ مدارس کے اندر علم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا اہتمام بے حد ضروری ہے۔

اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ آنے والے طالبعلم اپنے ماضی کے اعتبار سے خواہ کیسے بھی رہے ہوں لیکن مدرسے میں آنے کے بعد جب ان کو اچھا ماحول نصیب ہوتا ہے اور اچھی تربیت ان کے لئے فراہم کی جاتی ہے تو ان کی زندگی ہمیشہ کے لئے قابل رشک نہیں انتہائی قابل رشک بن جاتی ہے۔میں نے اس کا کئی مرتبہ مشاہدہ کیا ہے۔اس لئے مدارس میں جہاں تعلیم کا اہتمام ہے وہاں تربیت کا اہتمام

بھی ہونا چاہئے۔تربیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ڈنڈا لئے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے پھرتے رہیں۔ان کو مرعوب کرنے کے لئے خوف زدہ اور دہشت زدہ نہ بنائیں بلکہ شفقت غالب ہونی چاہئے۔کہیں ضرورتِ شدیدہ کے پیش نظر اگر تادیب کی ضرورت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔لیکن عمومی احوال میں اور اکثر اوقات میں تربیت کے لئے شفقت کے پہلو کو غالب رکھا جانا چاہئے۔

دوسری ایک بات میں یہ سمجھتا ہوں کہ

اچھے معلم اور مدرس کی پہچان یہ ہے کہ طلبہ اس کے سبق کو اتنی اہمیت دیں کہ وہ کسی قیمت پر اس سبق کو ناغہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں اور اس استاد کے سبق کو یاد کرنے میں وہ مبالغہ کی حد تک کام لیں۔

اگر کوئی استاد ایسا ہے کہ طالبعلم اس کے سبق میں کبھی آتا ہے کبھی نہیں آتا، اس کے سبق کو یاد کرنے کا اہتمام نہیں کرتا، تو وہ استاد ناکام ہے۔وہ کامیاب استاد نہیں کہلائے گا۔کامیاب استاد وہی کہلائے گا کہ جس کے سبق کے ساتھ طلبہ کو شغف ہو اور وہ اس کو ناغہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں اور اس کو یاد کرنے کا پورا اہتمام کریں۔یہ کب ہوگا؟ یہ جب ہوگا جب کہ

استاد سبق کی ایسی تیاری کر کے آئے کہ وہ سبق اس کو زبانی یاد ہو۔مختلف عنوانات سے وہ طلبہ کو سمجھانے پر قادر ہو۔

ایسا نہ ہو کہ کتاب کے تابع ہو کر وہ بات کر رہا ہے۔کتاب ہٹا دی جائے تو وہ سبق کے بیان کرنے سے قاصر ہو۔پورا سبق استاد کو خود اپنے ذہن میں پورے طریقے سے محفوظ کر کے درسگاہ میں آنا چاہئے۔اور سبق کی تقطیع کر کے سمجھانا چاہئے۔یہاں سے لے کر یہاں تک یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔اور یہاں سے لے کر یہاں تک یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد پھر جزء اول کا خلاصہ بھی نہایت آسان عنوان سے بیان کرے۔دوسرے جزء کا خلاصہ بھی نہایت آسان عنوان سے بیان کرے۔پھر اس کے بعد کتاب پر منطبق کرے۔اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو طالبعلموں کو بہت سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

ہم نے اپنے بعض اساتذہ کو دیکھا کہ ان کو سبق پڑھانے کے لئے کتاب کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔"بیضاوی شریف" "توضیح تلویح" اسی طریقے سے "خیالی" جیسی مشکل کتابیں استاد کتاب

سامنے رکھے بغیر پڑھاتے تھے۔اور وہ طالبعلموں پر اپنی ایسی گرفت قائم کر لیتے تھے کہ طالبعلموں کو نماز میں وسوسے آسکتے ہیں، دعا کے وقت وسوسے آسکتے ہیں، لیکن ان کے سبق میں بالکل وسوسہ نہیں آتا تو اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ ان کے سبق کو خوب یاد کرتے تھے اور ان کے سبق میں حاضری کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ

استاد کو اس بات کی بہت رعایت کرنی چاہئے کہ جو طلبہ جماعت میں کمزور ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھ کر سبق پڑھایا جائے۔

مختلف استعداد کے لڑکے ہوتے ہیں، بعض وہ ہوتے ہیں جو مطالعہ میں خود ہی کتاب کو حل کر کے لاتے ہیں۔ بعض وہ ہوتے ہیں جو استاد کی بات سن کر کتاب کو بہت آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو ایک مرتبہ بیان کرنے سے سبق سمجھ میں نہیں آتا۔ تو ان کے لئے عنوان بدل کر آسان طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی جائے۔اس سے بے نیاز ہو کر پڑھانا کہ سبق سمجھ میں آرہا ہے یا نہیں آرہا یہ درست اور صحیح نہیں۔

طلبہ کو سبق میں سوال کی اجازت بھی ہونی چاہئے

بعض لوگوں کو دیکھا کہ ان کے سبق میں اگر کسی طالبعلم نے سوال کر لیا تو اس پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ یا الزامی جواب دے کر اس کو خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ بلکہ طالبعلم کے سوال کا منشا سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس کو حل کرنے کے لئے اور طالبعلم کو مطمئن کرنے کے لئے اطمینان بخش جواب دینا چاہئے۔

اسی طریقے سے یہ بھی ضروری ہے کہ

طالبعلم اور استاد کے درمیان مرتبے کا فرق برقرار رہے۔

بعض استاد طلبہ سے اتنے بے تکلف اور فری ہو جاتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کے مرتبہ کی رعایت باقی نہیں رہتی، یہ بھی بالکل غلط ہے۔ بعض ایسے عبوساً قمطریرا بن کر رہتے ہیں کہ طالبعلموں کو استاد سے دریافت کرنے کی جرأت اور ہمت نہیں ہوتی، یہ باتیں غلط ہیں۔

آپ کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہئے کہ فرق مراتب بھی برقرار رہے اور طلبہ کو اپنا سوال پیش کرنے میں کسی طرح کی الجھن اور بہت تکلف نہ ہو۔

اس کے علاوہ ہمارے مدارس کے اندر

جو طلبہ پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان کی ذہن سازی اس نکتۂ نظر سے بھی بے حد ضروری ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔

میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ بہت سے لوگ تعلیم تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں یا صنعت کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں یا زمینداری کو اختیار کر لیتے ہیں تو دس پندرہ سال میں جو علم انہوں نے حاصل کیا ہے، اس سے نہ وہ خود مستفید ہوتے ہیں اور نہ خلق خدا کو مستفید کرنے کے لئے کوئی منصوبہ بناتے ہیں۔

میں نے بہت سے مولویوں کو دیکھا انہوں نے پڑھا ہے پڑھنے کے بعد عالم فاضل ہو گئے اور کئی میری نظر میں ایسے ہیں کہ جن کی استعداد بہت اعلیٰ، بہت عمدہ اور بہت بہترین تھی لیکن عالم بننے کے بعد انہوں نے تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ کسی نے گاڑی چلانا شروع کر دی، کسی نے فوج کے اندر نوکری شروع کر دی، کسی نے کارخانہ لگا لیا تو اس طرح کے کام (یعنی) کارخانہ لگانے والے یا فوج کی نوکری کرنے والے کیا کچھ کم ہیں؟ لاکھوں کروڑوں میں سے سینکڑوں کی تعداد میں یعنی نہایت کم مقدار میں لوگ علم دین حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ علم دین کی اشاعت کے لئے اگر اپنے آپ کو مختص نہ کریں تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ:

ان مولویوں نے علم حاصل کرنے کے بعد اپنی اولاد کو دوسرے شعبہ سے متعلق کر دیا اور علم دین کے لئے اپنی اولاد کا انتخاب نہیں کیا، وہ اپنے عمل سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ہم تو بدقسمت تھے جو ہم نے علم دین حاصل کیا، ہم اپنی اولاد کو بدقسمت نہیں بنائیں گے۔

کئی لوگ ایسے ہیں کہ خود تو عالم ہے لیکن اپنی اولاد کو عالم نہیں بناتے، علم کو رواج دینے کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو مختص نہیں کیا اور اپنی اولاد کو بھی علم دین کے لئے مدارس میں داخل نہیں کیا۔ ایسے لوگ اللہ معاف فرمائے ہماری نظر میں علم دین کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں............ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس دین کی حفاظت کے لئے فراستِ نبوت کو نظر انداز کر کے دوسرے طریقوں کو خود اپنے لئے

اختیار کرنا اور اپنی اولاد کے لئے اختیار کرنا یہ انتہائی ناشکری کی بات ہے۔

بہر حال میری دعا یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو علم دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔ اور آپ کی تمام توانائیاں اور آپ کی تمام صلاحیتیں علم دین اور علمِ شریعت کی اشاعت اور اس کو عام کرنے کے لئے قبول فرمائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائیں آپ کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

☆......☆......☆

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۳ رمئی بروز جمعرات ۲۰۱۰ء﴾

الحمدلله رب العالمين والصلاة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين وعلى اله وصحبه اجمعين

اما بعد! فقد قال النبي ﷺ العلماء ورثة الانبياء

قابلِ صد احترام معلمین اور معلمات السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ سب علماء ہیں اور عالمات ہیں اس لئے یہ آپ کے سامنے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی، جس کو آپ نہیں جانتے، بلکہ یہ مذاکرہ ہے۔ جیسے طلبہ بیٹھ کے تکرار کرتے ہیں، مذاکرہ کرتے ہیں، تو یہ بھی اہل علم کا مذاکرہ ہے، ہم ایک دوسرے کو وہ چیزیں یاد دلاتے ہیں جو ہمیں کرنی چاہئیں، جن کے کرنے سے بعض دفعہ ہم غافل ہوتے ہیں، یا جان بوجھ کر توجہ نہیں دیتے، تو اصل مقصود یہی ہے کہ ہم اس مذاکرے کے ذریعہ اپنے اندر نشاط پیدا کریں، اپنی ہمتوں کو بڑھائیں اور جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اسے اور اچھے انداز میں ہم ادا کرسکیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اپنے مقام کو پہچانیں، آپ کا مقام کیا ہے، یہ اتنا اونچا مقام ہے کہ جس کے مقابلے میں دنیا کے بڑے سے بڑے منصب ہیچ ہیں، اس سے بڑھ کر ایک عالم کی سعادت کیا ہوگی کہ آپ ﷺ فرمارہے ہیں:

العلماء ورثة الانبياء

علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام ہدایت لے کے آتے ہیں، دین لے کے آتے ہیں اور اس دین کی وراثت علماء کو ملتی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام روپیہ پیسہ چھوڑ کے نہیں جاتے علم چھوڑ کے جاتے ہیں جس نے اس علم کو حاصل کرلیا اسے یہ میراث مل گئی۔ یہ اتنا اُونچا مقام ہے۔ انبیاء کرام اور پھر خاتم الانبیاء ﷺ ان کی خصوصیت یہ ہے ایک طرف قرآن کہتا ہے

هو الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق

ترجمہ: اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر بھیجا اور دین حق

اب یہ ہدایت، دین حق جو کتاب اور سنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے اس ہدایت کو لینے والے اس کے وارث کتنا اونچا مقام ہو گا ان کا اور آپ ﷺ خود فرما رہے ہیں:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا۔ تو جس نے یہ میراث حاصل کر لی اس کا کتنا اونچا مقام ہے تو معلم، تعلیم، تدریس یہ اتنا اونچا مقام ہے کہ بخدا اس کے مقابلے میں دنیا کے اونچے سے اونچے منصب ہیچ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سارے عارضی ہیں مادّی ہیں، آپ اور ہم اس زمانے میں یہ تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ایک شخص صبح اونچے مقام پہ بیٹھا ہوا ہے وزارت عظمیٰ پہ بیٹھا ہوا ہے اور شام ہوتی ہے تو وہ جیل کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا ہے۔ لیکن یہ وہ منصب ہے جس کو کوئی چھین نہیں سکتا اور یہ وہ منصب ہے جس سے وہ سکون ملتا ہے جو کہ بڑے سے بڑے مادّی مناصب میں نہیں ملتا۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

اور جب علماء آپ ﷺ کے وارث ہیں تو جس طرح علم اور دین میں وراثت چلتی ہے ایسے ہی تمام شعبوں میں جہاں ہمارے لئے آپ کی اقتداء مطلوب ہے ان میں نیابت ہونی چاہئے آپ کی اہم صفات میں صفت معلم ہے۔

لقد منّ الله علی المؤمنین إذ بعث فیهم رسولاً من أنفسهم یتلوا علیهم آیاته ویزکّیهم ویعلّمهم الکتاب والحکمة.

اللہ نے بطور انعام کے ذکر کیا۔ ایسا پیغمبر بھیجا جن کے کام کیا ہیں؟ فرائض نبوت **یتلوا علیهم آیاته** قرآن کی آیات کو پڑھ پڑھ کر سنانا۔ اس لئے قرآن کی تلاوت مستقل عبادت ہے چاہے آپ اس کو سمجھیں یا نہ سمجھیں اسی لئے آپ ﷺ نے جو مثال دی ہے وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ نفس تلاوت اس پر جو ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اس میں فہم ضروری نہیں ہاں فہم سے اس میں اضافے ہوتے رہیں گے آپ نے فرمایا کہ قرآن کا ایک ایک لفظ جو پڑھے گا اس پہ دس نیکیاں ملیں گی اور آگے مثال جو دی ہے "الم" فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ "الم" ایک حرف ہے۔ **بلکہ الفٌ حرفٌ و لامٌ حرفٌ ومیمٌ حرفٌ** تو گویا جس نے "الم" کی تلاوت کی اسے تیس نیکیاں مل گئیں اور آپ سب جانتے ہیں جب آپ تفسیر پڑھتے ہیں کوئی بھی تفسیر آپ اٹھا کے دیکھ لیں جہاں حروف مقطعات آتے ہیں آگے

لکھا ہوتا ہے ''اللہ اعلم بمرادہ'' اللہ کو پتہ ہے اس کی مراد کیا ہے۔ یہ راز ہیں۔ تو جب ہمیں ان کے معنی نہیں معلوم اس کے باوجود نیکیاں مل رہی ہیں باقی کا آپ خود اس پر قیاس کرلیں۔ اسی لئے شیطان چونکہ ہمارا دشمن ہے وہ اس ثواب سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے اب ظاہر ہے ہر آدمی تو عالم نہیں بن سکتا وہ تو عالم پڑھے گا تو سمجھ کے پڑھے گا لیکن عوام الناس وہ تلاوت کرتے ہیں اللہ کا کلام سمجھ کر برکت کے لئے، ہاں اس کلام کے اندر جو اللہ کے احکام ہیں وہ علماء سے سن کر اس پر عمل بھی کررہے ہیں شیطان دھوکہ یہ دیتا ہے شیاطین الانس والجن کہ جب اسے سمجھے نہیں تو فائدہ کیا ہوا، یہ کوئی انسانی کلام ہے کہ جس کے بغیر سمجھے کوئی فائدہ نہیں یا کوئی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ ہے کہ جب تک عمل نہیں کروگے کوئی فائدہ نہیں یہ تمثیل ہی غلط ہے یہ اللہ کا کلام ہے! اللہ کا کلام!! اس لئے کہ خود اس کلام کی بقاء کے لئے جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے تلاوت کو فرائض نبوت میں شامل کیا گیا ہے اس کے سننے کے لئے فرشتے آتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا فرشتے مکلف ہیں؟ لیکن اللہ کا کلام وہ بھی سنتے ہیں تو خیر یہ تو ایک ضمنی بات آئی تھی۔

آپ کے فرائض نبوت میں تلاوت قرآن، تعلیم قرآن، حکمت اور تزکیہ یہ چار فرائض ہیں، تو جن کو اللہ نے آپ ﷺ کی یہ نیابت دی ہے ان کے اندر یہ جامعیت ہونی چاہئے۔ کمی ہے تو محنت کرکے اپنے اندر جامعیت پیدا کی جائے، تو میرے محترم معلمین اور معلمات ہمیں سب سے پہلے اپنے مقام کو پہچاننا چاہئے کتنا اونچا مقام ہے معلم کا۔ اور اس کے اندر جو سکون ہے جو روحانیت ہے آپ یقین جانیں کسی اور منصب میں آپ کو نہیں ملے گا، اور قرآن کریم کی وہ آیات، احادیث جن میں معلم کی ،علماء کی تعریف اور مقام بیان کیا گیا ہے وہ اپنے سامنے لے آیئے۔ آپ سب علماء ہیں۔

خیر کم من تعلّم القرآن وعلّمه

خیر کم بلا استثناء فرمایا اور ایک اور روایت بڑی عجیب ہے اس کے اندر فرمایا کہ:

لاحسد إلا في اثنتين

دو انسانوں کی زندگیاں قابل رشک ہیں دنیا میں تو بے شمار شعبے ہیں سینکڑوں شعبے ہیں، زندگی کے لیکن قابل رشک صرف دو ہیں

لاحسد إلا في اثنتين رجل آتاه الله العلم والحكمة فهو يعلّمها و يحكم بها

پہلا انسان وہ ہے جس کو اللہ نے علم اور حکمت دی، دین دیا، دین کا علم دیا۔ اب وہ اسے پھیلا رہا ہے پڑھا رہا ہے، اس کے مطابق فیصلے دے رہا ہے۔ یہ ہے قابل رشک زندگی۔

اور دوسرے شعبوں میں وہ شخص قابل رشک ہے جس کو اللہ نے مال دیا لیکن وہ مال عیاشی میں نہیں اسراف اور دنیا کے دوسرے شعبوں میں نہیں، دن رات اس فکر میں ہے کہاں دین کا کام ہو رہا ہے میں اس میں جا کے خرچ کروں بعض روایتوں میں تو عجیب اس کی تعبیر ہے۔

فسلطه على هلكته في الحق

اللہ نے مال دیا اور پھر اس کو مال کو حق میں خرچ کرنے پر مسلط کر دیا، یعنی اس کی اور فکر ہی نہیں سوائے اس کے کہ یہاں کام ہو رہا ہے مسجد بن رہی ہے چلو جی یہاں بھی حصہ لو، مدرسہ بن رہا ہے، فلاں فقراء مساکین کا کوئی کام ہو رہا ہے اس میں خرچ کر رہا ہے۔

یہاں کراچی میں ایک ایسا گروپ ہے ہم طالبعلم تھے اس وقت سنا وہ کہتے تھے کہ اللہ نے ہمیں اتنا دیا ہے کہ ہم کچھ کام نہ کریں نہ کوئی کارخانہ چلائیں نہ کوئی دکان اسے ہماری نسلیں ختم نہیں کرسکتیں۔ اتنا اللہ نے دیا ہے اس کے باوجود ہم کارخانے چلا رہے ہیں، مختلف کاروبار کر رہے ہیں، تاکہ اللہ کے دین کے جو یہ کام ہو رہے ہیں اس میں حصہ لیں۔ تو آپ نے فرمایا دو انسانوں کی زندگی قابل رشک ہے ایک وہ شخص جس کو اللہ نے علم دیا اس میں لگا ہوا ہے، اور مال دیا تو اسے راہ حق میں صرف کر رہا ہے، اس لئے کہ اگر ایسا نہیں کریگا تو وہ مال خود وبال بن جائے گا۔ جس سے گناہ ہونگے اسراف ہوگا اور غلط کام ہونگے۔

تو اصل مقصود یہ ہے کہ آپ اور ہمیں اللہ نے جو میدان دیا ہے اس کی قدر کیجئے، اپنے مقام کو پہچانئے، اور جب انسان اخلاص کے ساتھ یہ کام کرتا ہے تو پھر اسے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اسے اونچے سے اونچا مقام ملے۔ دین کا کوئی شعبہ بھی ہو۔

ہمارے حضرت شیخ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک انسان اخلاص کے ساتھ قاعدہ پڑھا کر جنت جا سکتا ہے، قاعدہ بچوں کو پڑھایا الف، ب، ت، اور قرآن ناظرہ پڑھایا ان کی تربیت ہو رہی ہے، اور بخاری بغیر اخلاص کے پڑھا کے جنت سے محروم ہو سکتا ہے۔ تو اصل چیز کیا ہے یہ اتنا اونچا مقام ہے کہ میں حیران ہوتا ہوں کہ اس کے بیان کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں آپ یقین کریں

ہمارے یہاں جب مولانا حبیب اللہ مختار شہید ان کو شہید کیا گیا اتفاق کی بات ہے کہ میں تھائی لینڈ میں ایک کانفرس میں تھا، میں یہاں موجود نہیں تھا مجھے وہاں پتہ چلا۔ خیر جب میں واپس آیا پتہ چلا کہ جامعہ کی شوریٰ نے وہ ذمہ داری وہ گٹھڑی میرے سر پر رکھ دی ہے تو میں نے شوریٰ کو بلایا اور میں نے کہا اللہ کے بندے تم نے کیا ظلم کیا، جامعہ میں بزرگ حضرات موجود ہیں، جوان موجود ہیں، بس میں ہی ملا اور کوئی نہیں ملا تمہیں۔ مجھے نہیں چاہئے حضرت مولانا یوسف لدھیانوی شہید موجود تھے اس وقت مفتی نظام الدین شہید موجود تھے تو میں نے کہا اور کوئی نہیں ملا آپ کو۔ تو بہر حال میں رونے لگا بلکہ میں نے کہا کہ قیامت کو جلدی لانا چاہتے ہو۔

إذا وسد الأمر الی غیر أهله فانتظر الساعة

لیکن مفتی صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا جملہ فرمایا کہ میں مجبوراً خاموش ہوگیا کہنے لگے اگر آپ نہیں مانتے تو ہم بوریا بستر باندھ کے جاتے ہیں یہاں میں خاموش ہوگیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے بھئی اس سے پہلے میں مدرس تھا بس۔ یا زیادہ سے زیادہ ناظم تعلیمات تھا، مجھے اسی میں مزا آتا تھا، کہ پڑھو، پڑھاؤ اور مطالعہ کرو۔ اور اسی تدریس کے دوران یہ جو آپ کے مدارس میں ابتدائی درجہ میں **الطریقة العصریہ** کتاب ہے یہ اسی محنت کا نتیجہ ہے۔ مجھے تو یہی مزا آتا تھا مدرس رہوں بس، لیکن بہر حال اب میں محروم ہوگیا، اب مشکل سے ایک سبق دیا ہوا ہے۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تدریس اور تعلیم ایسی عجیب چیز ہے کہ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لہذا آپ اپنے مقام کو پہچانیں، اور دنیا کی طرف مت دیکھیں مادی دنیا کی طرف مت دیکھیں۔

لاتمدّن عینیك إلی مامتعنا به أزواجاً منهم زهرة الحیاة الدنیا

قارون جیسا انسان جس کا خزانہ اتنا تھا کہ چابیوں کے لئے بھی ایک پورا گروپ چاہئے لیکن وہ اس کے لئے وبال بنا تو یہ دنیا، مال، یہ اتنی بڑی بڑی تنخواہیں، کالجوں میں کچھ نہیں۔ آپ کو جو اللہ نے مقام دیا ہے اور قناعت دی ہے۔ اس پر شاکر رہیں۔

ہمارے حضرت شیخ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے یہ تنخواہ نہیں ہے یہ کفاف ہے تاکہ انسان زندہ رہے۔ اصل بدلہ اللہ وہاں دے گا۔ تو ہاں اس ضمن میں احادیث میں آتا ہے کہ جنت میں جا کے بھی عوام الناس علماء سے مستغنی نہیں ہونگے، جی ہاں دنیا میں تو مستغنی ہو ہی نہیں سکتے پیدا ہونے سے مرنے

تک مستغنی نہیں ہوسکتے۔ یہ شیطان کا دھوکہ ہے بعض شیاطین الانس والجن کہتے ہیں کہ ان مولویوں نے ٹھیکہ نہیں لیا، تم خود قرآن پڑھو، خود قرآن سمجھو، خود قرآن پر عمل کرو، یہ شیطانی وسوسے ہیں، میں ایک جملہ میں جواب دیا کرتا ہوں اگر یہی جاہل بے دین یہ لکھے کہ بھائیو ڈاکٹروں نے علاج کا ٹھیکہ نہیں لیا تم خود میڈیکل پڑھو، خود سمجھو، خود علاج کرو تو آپ میں سے ہر ایک یہی کہے گا: اس کو پاگل خانے بھیجو، اس کے دماغ کا علاج کرو، آج تک کوئی بغیر پڑھے ڈاکٹر بنا ہے؟ تو بغیر دین پڑھے ہوئے کوئی عالم بنے گا؟ محض ترجے دیکھ کر ''ضلوا فاضلوا'' خود بھی گمراہ ہوتے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

ہمارے علمی مرکز دیوبند، دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں میں سے کسی نے کہا ہے کہ اگر اللہ نے بار بار پوچھا تو ہم کہیں گے یا اللہ کچھ طالب علم ہوں اور ہم ان کو بیٹھ کر سبق پڑھائیں۔ اتنا مزا ہے اس تعلیم وتدریس میں کہتے ہیں کہ جنت میں بھی اگر ہماری بات مانی گئی تو ہم کہیں گے یا اللہ کچھ طالبعلم ہوں ہمارے سامنے ہم آپ کا دین پڑھائیں اُن کو۔ اتنا اونچا مقام ہے اس لئے بھائی اس اعتبار سے ہر انسان معلم، معلم مطمئن رہے اللہ نے بہت اونچا مقام دیا ہے کہ دنیا کی طرف سے ہمیں واہ واہ کی ضرورت نہیں ہے اللہ کے یہاں جو مقام ہے، بہت اونچا مقام ہے۔

جب یہ بات ہے تو جو شخص دوسرے کا نائب ہوتا ہے اس کی ذمہ داریاں بھی اس پر آتی ہیں۔ اور وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ تمام صفات جو اصل میں ہیں وہ بھی اپنے اندر پیدا کرے، تو پیغمبر ﷺ کے بارے میں آپ سب جانتے ہیں اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ علم آپ کو دیا گیا ہے

وعلّمك مالم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما

ہر مدرّس اور مدرّسہ کی کوشش یہ ہو کہ حتی الامکان اپنے اندر کمال پیدا کرے

جو بھی فن ہو خاص طور پر جو فن ہم پڑھا رہے ہیں اس کے اندر کمال پیدا کریں، اور کمال کے لئے ضروری ہے کثرت مطالعہ ہو۔ جو کتاب ہم پڑھا رہے ہیں اس کو بھی دیکھیں، اس کے حواشی دیکھیں، اس کی شروح دیکھیں، اور اس فن کی بڑی بڑی کتابیں بھی دیکھیں صرف طلبہ کو پڑھانے کے لئے نہیں اپنے علم میں اضافہ کے لئے۔

بعض علماء کا کہیں جملہ پڑھا تھا کہ استاذ جو کتاب پڑھا رہا ہے وہ جتنا سبق طلبہ کو پڑھاتا ہے اس سے دوگنا معلومات اس کے ذہن میں ہونی چاہئیں۔

کمال پیدا کرنے کے لئے بہترین طریقہ یہی ہے کہ جو آپ کو کتاب ملی ہے اور جس فن کی ہے اس کا آپ خوب مطالعہ کریں۔ اس کے مطولات اور شروح کو دیکھیں۔

اس لئے نہیں کہ جو کچھ ہم دیکھیں یہ طلبہ کے ذہن میں ڈالنا ہے، طلبہ وہی پڑھنا ہے جو کتاب میں لکھا ہے لیکن اپنے علم میں اضافے کے لئے یہ ضروری ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی صفات میں یہ تھا کہ آپ نہایت ہی فصیح اللسان تھے۔

أفصح العرب وصاحب جوامع الكلم

اس لئے آپ جس زبان میں پڑھا رہے ہیں کوشش یہ کریں کہ اس زبان میں آپ کو کمال حاصل ہو

اور اس کا طریقہ یہی ہے ہمارے یہاں عام طور پر اردو زبان ہے، تو اردو زبان کے اندر اچھی اچھی کتابیں مطالعہ کریں، آپ ایسی کتابیں جن میں زبان بھی ہے، اور علم بھی ہے، یہ جو بہت سی کتابیں ہمارے بزرگوں نے لکھی ہیں، آپ ان کو پڑھیں، تو زبان بھی آپ کو آئے گی اور علم بھی آئے گا اسی طرح کتاب العلم بخاری شریف میں ہے دوسری حدیث کی کتابوں میں کتاب العلم کا مطالعہ کیجئے۔ آپ ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ماكان رسول الله ﷺ يسرد الكلام كسردكم

تمہاری طرح آپ ﷺ جلدی جلدی باتیں نہیں کیا کرتے تھے بلکہ آپ اس طرح بات کرتے

كان اذا تكلم فهمه كل من سمعه

جو سنتا اسے سمجھ جاتا، اور بعض الفاظ یہاں تک آتے ہیں کہ آپ کے الفاظ کو کوئی گننا چاہتا تو گن سکتا تھا، غالبًا ابو موسی اشعری یا دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ جب گفتگو فرماتے تو ضرورت کے وقت ایک بات کو آپ تین دفعہ دھراتے بھی تھے تاکہ ہر سننے والا اسے سمجھ سکے یہ سب ایک کامیاب معلم کی صفت ہے

اسی طرح آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام اور اپنے طلبہ پر جو اصحاب صفہ تھے نہایت ہی شفیق تھے

آپ ﷺ نے کسی کو گالی نہیں دی، کسی کو سخت بات نہیں فرمائی، کسی کو ڈنڈے سے مارا نہیں ہے، بلکہ نہایت نرمی کے ساتھ اور اگر کبھی کوئی ایسی چیز ہو بھی جو طبیعت کے خلاف تھی تو آپ کا انداز یہ تھا آپ سب علماء ہیں حدیث پڑھ چکے ہیں

مابال اقوام یعملون کذا و کذا

کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے وہ ایسا کیوں کرتے ہیں ایک عام بات فرماتے تا کہ جو شخص جس میں کوتاہی ہے وہ خود ہی سمجھ جائے اور اپنی اصلاح کر لے، تو آپ ﷺ اپنے شاگردوں پر نہایت شفیق تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ کے فرائض میں یہ بھی ہے "ویزکیھم" تربیت، لہذا آپ کو چاہئے کہ طلبہ کی تربیت کریں

اور تربیت کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ خود مجسم اخلاق بن جائیں

جو چیز آپ شاگردوں کو دینا چاہتے ہیں پہلے اسے اپنے اندر لے آئیے تو بعد میں آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ ﷺ غالباً غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر جب مکہ والوں سے معاہدہ ہوا اور یہ طے پایا کہ اگلے سال آپ عمرہ کریں گے، ابھی آپ واپس تشریف لے جائیں، تو آپ ﷺ اپنے ساتھ چونکہ جانور بھی لے گئے تھے ذبح کرنے کے لئے تو آپ نے حکم دیا صحابہ کو کہ اپنے جانور ذبح کرو، سر منڈواؤ پھر واپس چلتے ہیں، تو صحابہ پر اتنا اثر تھا اس وقت کہ اس حکم کے امتثال میں تاخیر ہوئی آپ ﷺ کے ساتھ اتفاق سے اس سفر میں ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں آپ خیمے میں تشریف لے گئے آپ کے غصے کو دیکھ کر اماں جان نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا بات ہے؟ فرمایا میں نے حکم دیا ہے اور اس پر کوئی عمل نہیں کر رہا، اتنی عقل مند خاتون تھیں خواتین میں بھی بڑی اونچی عقل مند ہوتی ہیں۔ تو فرمانے لگیں یا رسول اللہ آپ کسی سے کچھ نہ کہئے۔ آپ تشریف لے جایئے اپنے جانور کو خود ذبح کریں اور اس کے بعد اپنا سر منڈوائیں، پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ باہر تشریف لے گئے۔ اپنے اونٹ کو نحر کیا۔ اور پھر کسی کو بلایا اور فرمایا: میرا سر مونڈو صحابہ نے جب دیکھا تو ہر ایک اپنے جانور ذبح کر رہا ہے جلدی جلدی سر منڈوا رہا ہے یہاں تک کہ جلدی میں بعضوں کے سر بھی زخمی ہو گئے۔ یہ ہے عمل، آپ ﷺ اگر کسی چیز کا حکم دیتے تو سب سے پہلے آپ خود اس پر عمل فرماتے۔ ہم طلبہ کے سامنے، اپنی تلمیذات کے سامنے اچھا نمونہ پیش کریں تا کہ شاگرد یہ سمجھے کہ میرا استاد میری معلمہ

نہایت ہی اسلام کا نمونہ ہیں اخلاق کا نمونہ ہیں یہ طالبعلم تلمیذ اور تلمیذہ یہ نہ سمجھے کہ میں جلاد کے پاس جارہا ہوں۔

ہمارے محترم تعلیم القرآن والے ان کے یہاں بھی ایک زمانے میں مہینہ کے آخر میں جب مدرسین کو تنخواہ وغیرہ تقسیم ہوتی تھی تو سارے مدرسین مسجد میں جمع ہوجاتے تو اس موقع پر مدارس میں سے بڑے بڑے حضرات کو بلا کے ان سے کچھ بیان کرواتے تھے، ایک دفعہ مجھے بھی بلایا گیا میں ان سے ایک گزارش کیا کرتا تھا کہ خدا کے لئے آپ اپنا ایسا نمونہ پیش کریں کہ آپ کے بچے آپ کے شاگرد جب آئیں خوشی سے آئیں اور اس خیال کو نہ لے کے آئیں کہ میں ایک جلاد کے پاس جارہا ہوں بلکہ میں ایک مشفق باپ کے پاس جارہا ہوں۔ تو بھائی یہ چیز بھی استاذ کے لئے بہت ضروری ہے کہ اپنے اندر اخلاق پیدا کرے اور کبھی تنبیہ کی ضرورت پڑتی ہے تو تنبیہ کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ دو چار منٹ کے لئے کھڑا کردینا ہی ایک سمجھدار طالبعلم کے لئے کافی ہوتا ہے، ساتھیوں کے سامنے پوری کلاس میں کھڑا ہے، آئندہ پھر وہ یہ کام نہیں کریگا۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ آپ مار مار کے ہاتھ توڑدیں یا آنکھ پھوڑدیں یا زخمی کردیں۔ یہ قطعاً جائز نہیں ہے شرعاً حرام ہے۔

لاہور میں ہم نے ایک واقعہ سنا ایک معلّمہ صاحبہ نے۔ اللہ ہم سب کی اصلاح فرمائے۔ کسی بچی نے سبق یاد نہیں کیا تو ہاتھ میں پنسل پکڑی ہوئی تھی تو یوں اس بچی کو پنسل ماری کہ اس کی آنکھ میں لگی آنکھ خراب ہوگئی اور اس کے ماں باپ نے جا کر پولیس میں مقدمہ کردیا لمبا چوڑا قصہ ہوا پھر جان چھوٹی بڑی مشکل سے، تو بھئی آپ معلّم ہیں اور معلّم باپ ہوتا ہے لہذا آپ کے اندر شفقت ہونی چاہیے آپ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ کیسے معاملہ فرماتے تھے۔

آپ کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دس سال میں نے آپ کی خدمت کی ان دس سال کے اندر کبھی آپ نے مجھے گالی نہیں دی کبھی مارا نہیں بلکہ یہاں تک کہ کوئی کام میں نے کیا تو یہ نہیں فرمایا کیوں کیا؟ نہیں کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں کیا؟ اتنے اونچے اخلاق تھے اور ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ آپ نے اپنے گھر والوں کو، خادموں کو، کبھی کسی کو مارا نہیں گالی نہیں دی۔ آپ حیران ہوں گے ایک بدو آیا اور بدو بچارے تہذیب کے آداب سے دور ہوتے ہیں علم جو نہیں ہے مسجد میں آیا اس کو تقاضہ ہوگیا اور کھڑے ہوکر ایک کونے میں پیشاب کرنا شروع کردیا۔ ایک شخص مسجد میں پیشاب

کر رہا ہے تو صحابہ کرام کا کیا حال ہوگا، اُٹھے مارنے کے لئے، آپ نے فرمایا چھوڑ دو چھوڑ دو پیشاب کرنے دو۔ مسجد میں چونکہ اس وقت ریت تھی کچا فرش تھا جب وہ فارغ ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک ڈول پانی لاکر اس پر ڈال دو پھر اس کو بلایا اور بلاکر فرمایا کہ دیکھو بھئی یہ مسجدیں عبادت کے لئے ہیں، تلاوت کے لئے ہیں، تعلیم کے لئے ہیں، ذکر کے لئے، اس کام کے لئے نہیں، تو اور کچھ نہیں کہا، یہ شخص جب اپنے قبیلے میں جاتا ہے تو جاکے آپ ﷺ کے بارے میں اپنے اہل قبیلہ سے کہتا ہے:

واللہ ما رأیت معلما أحسن منه لا قبله ولا بعده

آپ جیسا معلم میں نے کسی کو نہیں دیکھا نہ آپ سے پہلے نہ آپ کے بعد میں نے یہ حرکت کی نہ مجھے برا بھلا کہا نہ مجھے ڈانٹا بڑی نرمی سے فرمایا کہ دیکھو یہ مسجدیں اس کام کے لئے نہیں ہیں۔ آپ اپنے اندر اخلاق پیدا کریں اور پھر یہ شاگرد آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہیں حدیث آپ پڑھ چکے ہیں

إذا مات ابن آدم انقطع عنه عمله إلا من ثلاث

جب انسان دنیا سے چلا جاتا ہے تو مرنے کے بعد بھی تین عمل ایسے ہیں جن کا اجر و ثواب مسلسل مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے۔

ان میں ایک یہ ہے:

أو علم ينتفع به

وہ علم جس سے لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں آپ کے شاگرد پڑھا رہے ہیں ان کے شاگرد پڑھا رہے ہیں تو یہ جو ہمارے شاگرد ہیں اگر ان کی ہم نے صحیح تربیت کی تو یہ ہمارے لئے صدقہ جاریہ ہونگے۔ تو بہر حال کہنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اسی جذبے کے ساتھ اپنے فرائض کو ادا کریں اور جو اللہ دیتا ہے اس میں قناعت کریں۔

القناعة كنز لا يفنى قناعت وہ خزانہ ہے جو ختم نہیں ہوتا

ورنہ تو لاکھوں کی تنخواہ ہو اور قناعت نہیں ہے تو حرص ختم نہیں ہوگی۔

لو كان لابن آدم واديا لابتغى واديا ثانيا الى آخر الحديث

یہ تو اللہ نے انسان کے نفس میں یہ چیز بنائی ہے حرص۔ پرانے زمانے میں کہا کرتے تھے کہ ۹۹ کا چکر بہر حال پیسے کی قیمت ہوتی تھی آج کل ۹۹ کو کون پوچھتا ہے یعنی پیسہ جمع کرتے کرتے ۹۹ ہو گئے تو

کہتے ہیں کہ ۱۰۰ تو پورے کرلوں سو ہو گئے تو پھر نیچے سے شروع کردیا تو یہ چکر تو ختم نہیں ہوتا لیکن جس کو اللہ تعالیٰ صبر دے قناعت دے یہ وہ خزانہ ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں اور اسی میں اللہ تعالیٰ سکون دیتا ہے وگرنہ یہ لکھ پتی، کروڑ پتی، ارب پتی، جا کے ان کی زندگیوں کو دیکھو ان کو نیند نہیں آتی سکون چھینا ہوا ہے ان کا الا ماشاء اللہ، ہاں جہاں ایمان ہے اور جہاں دین ہے وہاں مال ہے تب بھی اس میں سکون ہے ابھی میں نے آپ کو جو حدیث سنائی ہے:

رجل آتاه الله مالا فسلطه على هلكته بالحق

تو بہرحال میرے محترم معلمین اور معلمات میں یہی عرض کررہا تھا کہ اپنے مقام کو پہچانئے اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں جو ایک کامیاب استاد یا استانی کی ہوتی ہیں اور اپنے اندر آپ ﷺ کے وہ اخلاق پیدا کیجئے جو ہمارے اندر پیدا کرنا مطلوب ہیں تو پھر آپ دیکھئے انشاء اللہ آپ کو کتاب کے مطالعے میں مزا آئے گا، پڑھاتے ہوئے مزا آئے گا اور جو بھی آپ دین کا کام کریں گے اور پوری توجہ دیں گے تو آپ کو مزا آئیگا۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کی صفات، آپ سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ پر جب پہلی بار وحی اتری تو جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو دبوچا ایک دفعہ دو دفعہ تین دفعہ اور

اقرأ باسم ربك الذى خلق الى آخر الآيات نازل ہوئیں

تو آپ کپکپاتے ہوئے گھر تشریف لائے اور اس وقت ام المومنین خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ کی ایک ہی بیوی تھیں نہایت ہی عقل مند اونچے اخلاق والی اور اپنے خاوند کے لئے سہارا۔ ایک نیک بیوی اپنے خاوند کے لئے سہارا بنتی ہے اس لئے وہ جس میدان میں کام کرتا ہے بہت کامیاب رہتا ہے۔ چونکہ وہ قریب سے آپ کو دیکھ چکی تھیں تو آپ کو فوراً تسلی دی:

لا والله لايخزيك الله أبدا

بخدا اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا کیوں کہ آپ کے اندر یہ صفات ہیں:

إنك لتصل الرحم و تحمل الكل و تقرى الضيف و تعين على نوائب الحق

آپ کے اندر وہ بنیادی صفات ہیں کہ جس شخص میں یہ صفات ہونگی اللہ اس کو کبھی رسوا نہیں کرتا

سب سے پہلی جو صفت آپ نے بیان کی ہے وہ کیا ہے۔

إنك لتصل الرحم

صلہ رحمی کیا ہے یعنی وہ رشتے جو آپ کو رحم کے ذریعہ ملاتے ہیں آپ ان کا خیال رکھیں۔ ان کا حق ادا کریں۔ ان میں ماں باپ بھی ہیں، بہن بھائی بھی ہیں، خالہ پھوپھی بھی ہیں بیوی بچے بھی ہیں آپ کا سسرال بھی ہے۔ آپ ایک ایک کا خیال رکھیں آپ ﷺ کے اندر چونکہ یہ چیزیں اعلیٰ اور کمال درجہ کی تھیں وہ ان کا مشاہدہ کر چکی تھیں اس لئے فرماتی ہیں جس شخص کے اندر یہ صفات ہوں اللہ اس کو کبھی رسوا نہیں کرتے۔ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہماری جماعت مدرسین میں بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ جن کے ماں باپ زندہ ہیں لیکن باپ کا منہ اِدھر اس کا منہ اُدھر۔ لوگوں کو تو ہم منبر پر کھڑے ہو کے ماں باپ کے حقوق سکھاتے ہیں اور خود اپنا حال یہ ہے۔ لوگوں کو تو ہم سکھاتے ہیں کہ بیوی بچوں کے یہ حقوق ہیں اور خود ہم اس سے کتنے دور پڑے ہوئے ہیں، بہن بھائیوں کے حقوق ، سسرال کے حقوق، اللہ کے بندو یہ تعلیم کس لئے ہے کچھ اس کا نمونہ تو ہماری زندگی میں آنا چاہئے۔ بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ مولوی صاحب ماشاء اللہ عالم بن گئے ہیں فاضل ہیں فلاں دارالعلوم سے فارغ ہیں۔ محض اس علم اور دین کی وجہ سے وہ رشتے دے دیتے ہیں لیکن اب ہمیں بھی تو اپنے مقام کا لحاظ کرنا چاہئے یا نہیں چاہئے؟ یہی حال دوسری طرف بھی ہے۔ بہت سے لوگ ان کو یہ شوق ہوتا ہے کہ جی آج کل مدارس بنات کھل گئے ہیں عالمہ بن گئی ہے۔ اب ہمیں بھی تو اس علم کی لاج رکھنی چاہئے تو بہر حال یہ عملی چیز ہے:

إنك لتصل الرحم

پھر دیکھئے یہ صرف عمل ہی عمل نہیں ہے اس کا بدلہ دنیا میں بھی دیا جاتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی میں برکت ہو، مال میں برکت ہو، اولاد میں برکت ہو، لوگ اس کو نیک نام سے یاد کریں

فليصل رحمه

تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے

صلہ رحمی کرو بھئی یہ نسخہ ہے کامیابی کا

إنك لتصل الرحم و تحمل الكل الى آخر الحديث

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی جو صفات تھیں ہمیں بھی کوشش یہ کرنی چاہئے کہ ہم اپنے اندر اس کا عشر عشیر سہی اپنے اندر پیدا کریں کچھ تو سامنے آنا چاہئے اور اس کے لئے اپنے بزرگوں کو دیکھیں ان کے حالات پڑھیں ان کی زندگی میں بہترین مثالیں آپ کو ملیں گی، اپنے اندر تسامح، صبر یہ سب چیزیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

میں اس دن کسی بزرگ کی کتاب پڑھ رہا تھا یعنی صبر اور معاف کرنے کا نتیجہ ایک دیہاتی بیچارہ مزدور، مزدوری کر کے پیسے ملے اس دن خوش ہوگیا کہ چلو آج کوئی اچھی چیز گھر میں پکے گی مرغی لے آیا اور اچھی اچھی چیزیں لے آیا اور بیوی سے کہا کہ آج پکاؤ بھئی بیٹھ کے کھائیں گے، تو وہ بیچاری سادی سی ہوگی تو اس نے بڑی اچھی طرح پکایا لیکن غلطی سے نمک زیادہ ہوگیا، خیر جب کھانے لگے تو نمک زیادہ لیکن وہ اتنا شریف انسان تھا حالانکہ مزدور ہے کہ اس نے احساس نہیں ہونے دیا، کھا گیا اور دل میں کہتا ہے کہ یہ اللہ کی بندی ہے میرے ذمہ لگی ہے اس لئے میں اس کو معاف کرتا ہوں، یا اللہ میں نے معاف کردیا، بات ختم ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ فوت ہوگیا۔ اور اعمال میں بیچارہ کمزور ہوگا تو وہاں پکڑا گیا تو جب اس کو اللہ کے سامنے لایا گیا تو اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ دیکھو تو نے میری ایک بندی کو معاف کیا ہے، اس کی غلطی کو معاف کیا ہے چلو آج میں اس کے بدلے تجھے معاف کردیتا ہوں۔

تو بھئی خدا کے لئے اپنی جماعت کو بدنام نہ کرو، کیونکہ ایک مولوی غلط کام کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں۔ دیکھو علماء ایسے، مولوی ایسے ہوتے ہیں ملا ایسے ہوتے ہیں، کیونکہ تقویٰ تو ہے نہیں، تو وہ پھر سب پر حکم لگاتے ہیں، جیسے آج کل اعداء اسلام اور بے دین۔ جب کسی ڈاڑھی والے نے کوئی کام کردیا تو کہتے ہیں مسلمان ایسا ہوتا ہے، مسلمان ایسا ہوتا ہے۔ پورے یہودیوں کا ٹولہ لگا ہوا ہے مسلمان کو بدنام کرنے کیلئے۔

بہر حال چونکہ میرا اصل مضمون ہے کہ آپ غیر عرب کو عربی کیسے پڑھائیں، تو اب آخر میں اس کے بارے میں کچھ عرض کرونگا اور اپنے اسی تجربے کی روشنی میں بات یہ ہے کہ

عربی زبان ہو یا کوئی زبان بھی ہو اس کے پڑھانے کے دو طریقے ہیں ایک ہے الطریقۃ المباشرہ ڈائرکٹ میتھڈ اور دوسرا ہے طریقۃ الترجمہ ٹرانسلیشن میتھڈ تو یہ

دونوں طریقے آج بھی دنیا میں استعمال ہوتے ہیں۔

تو ڈائرکٹ میتھڈ یہ ہے کہ آپ اور آپ کے شاگرد میں اگر کوئی مشترک زبان نہیں ہے تو مجبور ہیں کہ آپ ڈائرکٹ میتھڈ استعمال کریں، بعض دفعہ ایک عالم کسی دوسرے ملک میں جاتا ہے اور وہاں کی زبان وہ نہیں جانتا، وہاں والے ہماری زبان نہیں جانتے، اردو نہیں جانتے مثلاً، اب آپ مجبور ہیں کہ آپ ان کو عربی سکھانے کے لئے ڈائرکٹ میتھڈ طریقہ استعمال کریں، اور یہ وہی طریقہ ہے جو ہم اپنے گھروں میں چھوٹے بچوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، یہ وہی طریقہ ہے جس سے ہماری ماؤں نے ہمیں اپنی مادری زبان سکھائی، ڈائرکٹ میتھڈ ہر ماں سب سے زیادہ اس کی جاننے والی ہے اور کمال رکھتی ہے، اب کیا ہوتا ہے گھروں میں ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے آپ میں اور اس میں کوئی مشترک زبان نہیں ہے تاکہ آپ اس سے کہیں کہ بیٹا دیکھو اس چیز کو اردو میں یہ کہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں اس کے پاس تو کوئی زبان ہی نہیں ہے اس لئے آپ کیا طریقہ استعمال کرتے ہیں ''ڈائرکٹ میتھڈ'' جب بچہ بولنے لگتا ہے جو چیز سامنے آتی آپ اسے کہتے ہیں مثلاً ماں نے اسے اٹھایا ہوا ہے ابا جان باہر سے آ گئے اماں کہتی ابا، ابا، ابا، اب وہ بھی منہ سے چپکے سے ابا ابا کرتا ہے، اور ابا جان محبت سے اب اس کو اٹھا کے کہتے ہیں اماں، اماں، اماں اب بار بار جب وہ سنتا ہے کہ یہ ڈاڑھی والا آیا ہے تو ابا، ابا، اور یہ بغیر ڈاڑھی والی اماں، تو کرتے کرتے وہ اس کی زبان پہ چڑھ جاتا ہے۔یہی حال جب دودھ سامنے آتا ہے پھر وہ مانگتا ہے پھر وہی نام لیتا ہے، کھانا ہے، روٹی ہے اور بہن ہے، بھائی ہے، ان کے نام۔تو وہاں پر ترجمہ نہیں ہوتا یہ ڈائرکٹ میتھڈ طریقہ ہے محسوسات کا جس کی اس طرح بنیاد ہے اور پھر ڈائرکٹ میتھڈ کے اندر بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ مفردات سے شروع کرتے ہیں، مفردات جیسے بچے کو آپ کبھی نہیں کہتے کہ ذرا سی بات اس نے شروع کی تو بیٹا نماز فرض ہے، لمبے لمبے جملے۔ابو آ گئے ہیں یہ کوئی نہیں کہتا، ابتداء میں مفردات ہیں ابا، اماں، بھائی، فلاں، فلاں، فلاں اور پھر تھوڑے تھوڑے جملے شروع ہو جاتے ہیں۔اس طرح آپ کو بہت کم موقع ملے گا اس لئے میں ادھر صرف اشارہ کرتا ہوں۔

آپ اگر کسی ایسی جگہ چلے جائیں کہ آپ کے شاگردوں میں اور آپ میں کوئی مشترک زبان نہیں ہے تو آپ جب ابتداء کریں گے تو کیا کریں گے آپ ان مفردات کو جو آپ کو پڑھانی ہیں اپنے ساتھ

لے جائیں کلاس میں جیسے کتاب ہے، قلم ہے، ورق ہے اور بہت سی چیزیں جو کلاس میں ہیں وہ چونکہ سمجھدار ہیں بڑی عمر کے ہیں تو آپ ان کے سامنے کتاب پکڑ لیں اور کتاب، کتاب، کتاب کہیں اب ان سے کہیں آپ کے ساتھ دھراتے رہیں تا کہ ان کا تلفظ صحیح ہو جائے، اسی طرح قلم ہاتھ میں لے کر، قلم، قلم، قلم کہیں اور ان سے کہیں آپ کے ساتھ بولتے رہیں اور کوئی چیز لے لی جیسے ورق، ورق، ورق ان سے کہیں بولتے رہیں یہ مفردات ہیں اور جب ان کی زبان پر یہ مفردات جاری ہو گئے تو اب آپ ان کو اشارہ سے اسم اشارہ سمجھا سکتے ہیں، هذا كتاب، هذا كتاب، هذا قلم، هذا ورق اب جملہ پورا ہو گیا تو جب ان کی زبان پر ھذا چل گیا تو گویا آپ کے شاگرد کے ہاتھ میں چابی آ گئی۔ اب آپ مزید کلاس کے اندر جو چیزیں پڑی ہوئی ہیں ان کی طرف اشارہ کریں۔ هذا كرسي، هذا جدار، هذا شباك، هذا باب، یہ چند جملے جب ان کی زبان پر چڑھ جائیں تو اب آپ ایک اور قدم آگے بڑھائیں اور ان سے سوال کریں اشارے کے ساتھ ہاتھ یوں کر کے "ماهذا؟ ماهذا؟ اور خود ہی جواب دیں هذا كتاب وہ سمجھ جائینگے کہ یہ سوال اور یہ اس کا جواب ہے۔ ان کی زبان چل جائے گی۔ تو اب آپ اسی کمرے میں مختلف چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماهذا؟ سے سوال کریں ابھی آپ کو قواعد بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے الی آخرہ اور پھر وہاں طلبہ بیٹھے ہوئے ہیں تو

هذا فلان، هذا فلان، هذا سعيد، هذا احمد، هذا عبد الله، من هذا؟ هذا طالب، هذا أستاذ الى آخره

تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ہے ڈائرکٹ میتھڈ یہ اس وقت آپ استعمال کرینگے جب آپ کے اور شاگردوں کے درمیان کوئی اور مشترک زبان نہیں ہوگی لیکن جب تک ہم اپنے ملک میں ہیں ہمیں اس کا موقع نہیں ملے گا۔

آپ یقین کریں آج مجھے تدریس کرتے ہوئے تقریباً چالیس سال تو ہو گئے ہیں بلکہ زیادہ اور میں یہ عربی بھی پڑھاتا رہا اور پاکستان سے باہر بھی میں نے پڑھایا ہے لیکن آج تک مجھے ضرورت نہیں پڑی کہ ڈائرکٹ میتھڈ استعمال کروں، سوائے تھوڑا سا ایک موقع ملا تھا وہ بھی یہیں پر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک کوریا کا طالبعلم آیا جو یہاں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو اس کو یہاں لایا گیا اور

میرے ذمہ لگایا گیا کہ اس کو عربی پڑھاؤں اب میں کورین نہیں جانتا وہ اردو نہیں جانتا اور عجیب بات یہ کہ وہ انگلش بھی نہیں جانتا تھا تو چلو ہم ٹوٹی پھوٹی انگلش میں سمجھا دیتے تو اب میں نے وہاں۔یہی ڈائرکٹ میتھڈ استعمال کیا اور اس کو پڑھانا شروع کر دیا طالبعلمی میں بہر حال لالچ ہوتی ہے اور کچھ زبانوں سے مجھے مناسبت بھی تھی تو جہاں میں نے اس کو الف، ب، سے شروع کیا حروف تہجی اس کو شروع کیا اور اس کو پڑھانے کے بعد آخر پانچ منٹ میں اس سے کہتا کہ تمہارے یہاں حروف تہجی کیا ہیں۔تو میں کاپی میں اس سے پوچھ کے لکھتا تھا لیکن چند مہینے کے بعد پھر پتہ نہیں کیا حالات ہوئے وہ واپس چلا گیا۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی فکر نہ کریں اور انشاء اللہ اس کی بہت کم ضرورت پڑے گی لیکن اگر پڑی تو میرے پاس یہ کتاب ہے''عربی زبان غیر عرب کو آپ کیسے پڑھائیں'' اساتذہ ٔعربی کے لئے راہنما کتاب ہے اس کے اندر پوری تفصیل ہے کہ آپ ڈائرکٹ میتھڈ سے کس طرح پڑھائیں گے اور اتفاق کی بات ہے کہ ہم ہر سال دورہ حدیث سے جو ہمارے یہاں طلبہ فارغ ہوتے ہیں تو امتحان کے بعد چالیس دن کا ایک کورس ہوتا ہے ایک تو اس میں مختلف فرق کے بارے میں اور ایک مضمون ہوتا ہے۔یہی کہ آپ عربی کیسے پڑھائیں اور وہ میرے ذمہ ہے اور وہی جو میں نے ان کو محاضرات دیئے ہیں وہ چھپ گئے ہیں عربی کے اندر بھی''کیف تعلم لغة العربیہ لغیر الناطقین بھا''اور اسی کا اردو ترجمہ بھی ہے''عربی زبان غیر عرب کو آپ کیسے پڑھائیں''۔

میں آپ کے لئے کتابیں لاتا میرا خیال تھا کہ یہ تقسیم کرونگا لیکن مجھے کہا گیا کہ یہاں اتنے سو مدرسین ہیں اور نسخے کم تھے تو میں نے کہا کہ بھئی اب ہم دوبارہ اس کو چھاپنے والے ہیں تو پوری چھپ جائے تو پھر سب کو دیں گے۔تو آپ حضرات اپنے طور پر اپنے اپنے مدارس سے کسی کو بھیج دیں تو انشاء اللہ میرے پاس جتنے نسخے ہیں میں وہ آپ کو بھیج دونگا۔اس کے اندر ڈائرکٹ میتھڈ کی ساری تفصیل موجود ہے۔

اب مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ یہ جو''طریقة الترجمہ''جو دوسرا ہے یہ بڑا اہم ہے جو ہمارے لئے ضروری ہے کہ عربی سکھانے کے لئے ترجمہ کا استعمال۔اور یاد رکھئے یہ نئی بات نہیں ہے آج دنیا کے اندر جتنی زبانیں سکھائی جاتی ہیں غیر زبان والوں کو ان میں یہ دونوں طریقہ استعمال ہوتے ہیں ڈائرکٹ میتھڈ بھی اور ترجمہ بھی اور اس کی موٹی مثال میں آپ کو دیتا ہوں عربی زبان اور انگریزی کی بی بی سی لندن جو عربی جاننے والوں کے لئے انگلش کا ایک پروگرام نشر کرتا ہے تو وہ انگریزی سکھاتا

ہے لیکن اس کی پوری تشریح عربی میں ہوتی ہے۔

میں جب قاہرہ میں تھا اپنی تعلیم کے سلسلے میں تو میں اپنے پاس ریڈیو رکھتا تھا تو وہاں سے لئے تو بی بی سی لندن سے یہ پروگرام ہوتا تھا تو وہ انگریزی سکھاتے تھے اس کی پوری تشریح عربی میں اور اس کے بعد پھر اس کی مشق انگلش میں ہوتی تھی اسی طرح قاہرہ ریڈیو انگلش والوں کو عربی سکھانے کا ان کے یہاں بھی ایک پروگرام تھا وہاں بھی ترجمہ استعمال ہوتا تھا تو وہ انگلش میں تفصیلات بیان کرتے اور پھر عربی کی مشق کراتے تھے تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے آج بھی دنیا میں زبانوں کو سکھانے کے لئے یہ طریقہ استعمال ہو رہا ہے ہمیں چونکہ خاص طور پر وہ اساتذہ کرام جو ابتدائی کلاسوں کو پڑھاتے ہیں عربی زبان۔ ان کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ترجمہ استعمال کریں لیکن ہمارا پرانا طرز نہیں پرانے طرز سے عربی اس کا مفہوم تو سمجھ میں آئے گا لیکن اس کا بولنا اور اس کا پڑھنا صحیح معنی میں یہ نہیں آئے گا ہمارا پرانا طرز کیا ہے کتاب کھولی اور ھذا کتاب، یہ کتاب ہے، **ھذا کتاب**، یہ کتاب ہے یہ کوئی زیادہ مفید طریقہ نہیں ہے۔ جی ہاں

تو اس کے لئے میں آپ کو بنیادی طور پر ایک نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آپ جب کتاب پڑھائیں گے تو سب سے پہلا کام آپ کا یہ ہے کہ تقریباً پانچ مرحلہ میں اس سبق کو تقسیم کرلیں۔

پہلا مرحلہ: یہ ہے کہ بطور مثال ''**الطریقة العصریه فی تعلیم اللغة العربیه**'' جو ہمارے یہاں درجہ اولیٰ میں پڑھائی جاتی ہے تو اس کا پہلا سبق یہاں اس میں موجود ہے **الدرس الاول** تو آپ اسی طرح جو بھی سبق آپ پڑھائیں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ زبان کوئی بھی ہو جب آپ سیکھتے یا سکھاتے ہیں اس زبان کے سیکھنے کے معنی یہ ہیں اس کا ہمیں بولنا آجائے صحیح معنی میں اور اس کا پڑھنا آجائے اور اس کا لکھنا آجائے تین چیزیں ہیں لکھنا، بولنا، پڑھنا تو اس کے لئے جو ہمارے یہاں طریقہ تعلیم ہے تو اس میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ یہ مقصد ہم حاصل کرسکیں اب بطور مثال کے طریقہ عصریہ کا پہلا سبق لے لیں۔

تو پہلا کام استاذ کا یہ ہے کہ طلبہ کو صحیح تلفظ کرائے

اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ استاذ پہلا سبق خود ایک ایک جملہ پڑھ کر طلبہ کو سنائے اور وہ ہر جملہ کو اس کے ساتھ دھراتے رہیں مثلاً:

بسم الله الرحمن الرحیم

الدرس الاول

کتاب،قلم،ھذا کتاب، ھذاقلم، ھذا ورق، ماھذا؟ ھذا کتاب، ماھذا؟ ھذا قلم، ماھذا؟ ھذا کرسی، آپ تجوید کے ساتھ تلفظ ان کوسکھائیں،اور جب آپ ایک جملہ پڑھیں گے، ماھذا ؟ ھذا کتاب، وہ پورے کلاس والے اس کواجتماعی طور پر پڑھیں، یہ نہیں کہ آپ پڑھ رہے ہیں اور وہ سن رہے ہیں، نہیں آپ ان سے کہلوایئے ایک ایک جملہ اس کا فائدہ کیا ہوگا کہ ایک تو وہ طلبہ ہوتے ہیں جو حافظ ہوتے ہیں، یا جنہوں نے تجوید سے قرآن پڑھا ہے ناظرہ، ان کے لئے تو آسانی ہے لیکن جو کمزور ہیں وہ بھی اگر ساتھ پڑھتے جائیں گے بلند آواز سے ان کی بھی تصحیح ہوجائے گی ،اور اس کی مثال ایسی ہے کہ بچے دوڑ لگاتے ہیں چلتے ہیں لیکن ایک بیچارا کمزور ہے،اور چل نہیں سکتا،ایک اِدھر سے آیا ایک اُدھر سے آیا اس نے سہارا دیا یہ بھی ساتھ بھاگ رہا ہے،تو یہ جو کمزور بچے ہوتے ہیں ان کو بھی فائدہ ہوتا ہے اس پڑھنے میں۔

تو پہلا مرحلہ یہ کہ آپ اول سے آخر تک ایک ایک جملہ پڑھیں اور طلبہ بلند آواز سے ساتھ ساتھ کہتے جائیں، پورا سبق آپ اس طرح ان کو پڑھادیں، آپ نے جب ایک دفعہ پڑھا دیا اب انہیں طلبہ میں سے ایک کو کھڑا کردیں اور وہ کتاب لے کر اسی طرح جس طرح آپ نے تلفظ کیا ہے ایک ایک جملہ پڑھتا جائے،اور سارے طلبہ بلند آواز سے اس کو کہتے جائیں اگر کلاس میں دس پندرہ طلبہ ہیں تو ہر ایک سے آپ پڑھوائیں لیکن بعض دفعہ طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو پھر آپ تقسیم کرلیں آج ادھر کے دس طلبہ نے پڑھا کل بعد والوں نے اسی طرح۔یعنی کوئی رہے نہیں اس میں کمزور سے کمزور بعض صوفی جو بول نہیں سکتے ان سے بھی پڑھوائیں تاکہ ان کی زبان چلے۔یہ پہلا مرحلہ ہے ان کا صحیح تلفظ،اب وہ کتاب میں دیکھ کر الفاظ کو سمجھ لیں گے بول لیں گے جس طرح ایک قاری صاحب بچے کو مشق کراتے ہیں بغیر قواعد سکھائے ہوئے اسی طرح بغیر قواعد کے آپ ان کو عربی سکھائیں۔

جب آپ سمجھ لیں کہ طلبہ کا تلفظ صحیح ہوگیا تو اب دوسرا مرحلہ شروع کریں دوبارہ کتاب ہاتھ میں لیں اور اسی طرح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الدرس الاول:

پھر وہ طلبہ آپ کے ساتھ پڑھیں گے ''پہلا سبق'' ھذا ، یہ اور یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ھذا اسم اشارہ ہے ھذا کتاب ، یہ کتاب ہے، سارے طلبہ آپ کے ساتھ پڑھتے رہیں گے ھذا قلم ، یہ قلم ہے، ھذا ورق ، یہ کاغذ ہے، اور پھر اگلے سارے جملے پڑھیں ماھذا؟ یہ کیا ہے؟ ھذا کتاب یہ کتاب ہے، ماھذا؟ یہ کیا ہے، سارے طلبہ کہتے رہیں آگے ''من ھذا ؟'' یہ کون ہے، ھذا طالب ، یہ طالب ہے، تو آخر تک آپ نے جب ان کو ترجمہ سے پڑھا دیا تو اب ان کو ان جملوں کے معنی بھی آگئے اور دو مرحلے ہو گئے

اب تیسرا مرحلہ: کیا ہے؟ آگے اس کی مشق ہے۔ مشق کے اندر کچھ الفاظ نئے ہیں کچھ پرانے۔ تمرین نمبرا: ان الفاظ کو ھذا کے ساتھ ملا کر پڑھیں، کرسی، عمود، سقف، کاس، ورق، تلمیذ، معلم الی آخرہ جیسے ھذا کرسی تو ایک طالبعلم کو آپ کھڑا کر دیں اور وہ اسی مشق میں یہ جو دس الفاظ لکھے ہوئے ہیں وہ ایک ایک جملہ پڑھے گا، ھذا کرسی ، اور سارے طلبہ اس کے ساتھ پڑھیں ھذا عمود، ھذا سقف، الی آخرہ۔

اب مشق نمبر۲ عربی میں ترجمہ کریں یہ پنسل ہے، یہ کھڑکی ہے، یہ دیوار ہے اور چونکہ اس میں آسانی یہ ہے کہ ایک سبق ھذا اسم اشارہ مذکر کا ہے اس میں مذکر ہی کے جملے آئیں گے مؤنث نہیں آئے گی اور اس میں اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

النحو فی الکلام کالملح فی الطعام

بقدر ضرورت تا کہ طالبعلم کو بات بھی سمجھ آجائے بوجھ بھی نہ پڑے اگر آپ مذکر میں مؤنث کی بحث کو شروع کر دیں گے تو گڑبڑ ہو جائے گی مؤنث کا مستقل سبق آرہا ہے۔ یہ درس مذکر کا ہے، یہاں پر جو جملے دیئے گئے ہیں وہ مذکر کے ہیں بس ان طلبہ کو ھذا ملانا پڑے گا۔ اسی طرح ہر طالبعلم کھڑا ہو کر ان جملوں کو پڑھے اور دوسرے ساتھ پڑھیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی زبانیں عربی سے مانوس ہو جائیں گی اب یہاں آخر میں آپ ان کو سمجھا دیں عربی گرامر کی چند اصطلاحیں۔ اس درس میں اسم اشارہ استعمال ہوا ہے اس لئے اسم اشارہ وہ لفظ ہے جس سے کسی چیز کی طرف اشارہ کیا جائے جیسے

ھذا کتاب اور جیسے اردو میں ہم کہتے ہیں یہ۔ تو عربی میں کہتے ہیں **ھذا**، بس اتنا ہی بیان کریں۔

اور اب چونکہ مؤنث اور مذکر کی اصطلاح آ گئی ہے تو بعض دفعہ نئے طلبہ کو پتہ نہیں ہوتا تو ان کو بتادیں مذکر کہتے ہیں نر کو جیسے **رجل، فرس، حجر**، اور اس کے اندر مزید آپ اپنے طور پر سمجھائیں کہ بھئی دیکھو ہر زبان میں ایک مؤنث اور مذکر وہ ہوتے ہیں جو سب جانتے ہیں ایک ہی قاعدہ ہے ہر زبان میں جہاں نر کے مقابلہ میں مادہ آتی ہے تو وہاں مذکر مونث ہر زبان میں ایک ہوتا ہے گھوڑا، گھوڑی، بکرا، بکری، مرد، عورت، لیکن ایک مذکر مونث وہ ہوتے ہیں جو اہل زبان کے استعمال سے سمجھ میں آتے ہیں ان کے لئے کوئی قاعدہ نہیں ہے اہل زبان نے اگر ان کو مذکر استعمال کیا ہے ہم بھی اس زبان میں مذکر استعمال کریں گے اور اگر اہل زبان نے ان کو مونث استعمال کیا ہے تو ہم بھی اس کو مؤنث استعمال کرینگے اور ان کو مذکر، مونث، غیر حقیقی کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر عربی زبان میں مسجد مذکر ہے **ھذا مسجد** لیکن اردو میں مونث ہے یہ بڑی مسجد ہے بڑا نہیں کہیں گے۔ ہر زبان میں یہ ہوتا ہے آگے قاعدہ ہے ھذا اسم اشارہ ہے مفرد مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے جب کہ وہ نزدیک ہو جیسے **ھذا کتاب**۔ آگے ما؟ اور من؟ یہ بھی اس درس میں ہے اس کے اندر بھی لمبی چوڑی تعریفوں کی ضرورت نہیں ہے ابھی ابتدائی طلبہ ہیں ان کو آپ کہہ دیں **ما**؟ اس لفظ سے کسی چیز کے بارے میں سوال ہوتا ہے۔ چیزوں کے بارے میں، ہر آدمی سمجھتا ہے چیز کیا ہوتی ہے اور **من**؟ سے انسانوں کے بارے میں سوال ہوتا ہے۔

اب آخری مرحلہ یہ بڑا اہم ہے چونکہ طلبہ کا تلفظ صحیح ہو گیا ہے، الفاظ کے معنی ان کو آ گئے یاد رکھو کہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی دن میں سب کچھ آ جائے، آپ یہاں تک پانچویں چھٹے مرحلہ تک چاہے دوسرے دن پہنچیں تیسرے دن پہنچیں اس کی فکر نہ کریں اور ابتداء میں تو آپ کا وقت لگے گا۔

آخری مرحلہ یہ ہے کہ آپ طلبہ سے کہیں کتابیں بند کر دیں اور اب یہی جملے جن کا آپ نے ترجمہ کیا ہے ان کو سمجھایا ہے اب ان طلبہ کے سامنے وہی چیزیں جو آپ نے پڑھائی ہیں ان کو ہاتھ میں لے کر یا اشارہ کر کے ایک ایک چیز کے بارے میں سوال کریں۔ ماھذا؟ ماھذا؟ اب سارے کہیں گے **ھذا کتاب ماھذا؟ ھذا قلم، ماھذا؟ ھذا ورق، ماھذا؟ ھذا کرسی، ماھذا؟ ھذا عمود، ماھذا؟ ھذا باب**، جتنی بھی اس کلاس میں چیزیں ہیں اشارہ کرتے جائیں ان سے پوچھتے

جائیں آپ جب فارغ ہو جائیں۔ تو پھر ایک کو کھڑا کریں کہ اب وہ اپنے ساتھیوں سے پوچھے، **ماھذا؟ماھذا؟ ماھذا؟**اس انداز سے جب آپ پڑھائیں گے تو اس کا فائدہ کیا ہوگا کہ ایک ہی گھنٹہ میں ایک بچہ جو اسکول سے آ کے درجہ اولی میں داخل ہوا پہلے دن ہی عربی کے تیس، چالیس جملے بول رہا ہے، سمجھ رہا ہے، پڑھ رہا ہے، یہ کتنا اچھا انداز ہے اس کے بعد بھی اگر ہم اس پر عمل نہ کریں تو یہ ہمارے لئے افسوس کی بات ہوگی کبھی آپ نے اپنے پرانا انداز میں دیکھا ہے کہ اتنے جملے طلبہ ایک دن میں بولنے شروع ہو جائیں؟ ساری کتاب ختم ہو جاتی ہے اور ایک جملہ بولنا نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے ہمارے استاذ ڈاکٹر محمد امین مصری رحمہ اللہ تعالیٰ جس زمانے میں میں دار العلوم میں پڑھ رہا تھا ہمارا یہ جامعہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا تو اس زمانے میں دار العلوم اور سیریا کے سفارت خانہ نے مل کر عربی استادوں کے لئے ایک پروگرام شروع کیا ایک کورس ایک سال کا **المعهد العالي لمعلمي اللغة العربية لغير الناطقين بها** کہ آپ غیر عرب کو عربی کیسے پڑھائیں اس کا باقاعدہ کورس تھا اور وہ ہمارے استاذ مصری ہمیں پڑھاتے تھے، مشق کراتے تھے، قواعد سکھاتے تھے، اور اس کے اندر سارے کے سارے عربی کے اساتذہ تھے سوائے میرے۔ میں اس وقت درجہ خامسہ کا طالبعلم تھا لیکن عربی میں میرے لگاؤ اور شوق کی وجہ سے انہوں نے استثنائی طور پر صرف مجھے ان استادوں کے ساتھ لے لیا وہ ہمیں مشق کرایا کرتے تھے تو اس کے بعد امتحان ہوا تو جو استاد عربی والے تھے وہ تو سمجھے ہم کو تو عربی آتی ہے اور میں طالبعلم تھا خوب محنت کی اب عجیب بات یہ ہوئی کہ میں ان میں اول آیا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے اندر کوئی کمال تھا بلکہ امتحان میں ایکٹنگ کرنی پڑتی تھی جس سے ان استادوں کا وقار مانع تھا اور میں طالب علم اس لئے امتحان میں ایکٹنگ کی اس کے بعد ان استادوں کی شام کے وقت مختلف جگہوں میں کلاسیں شروع کیں اور انہیں ان استادوں پر تقسیم کر دیا۔ اور بنوری ٹاؤن مسجد میں ابھی تک ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا شروع کی اور مجھے کہا کہ آپ یہاں پڑھائیں اس وقت مدرسہ نہیں بنا ہوا تھا میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ایک دن وہ ہمارے استاد ڈاکٹر امین مصری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھ ایک بچہ تھا چھوٹا سا آٹھ، نو سال کا ہوگا تو وہ آئے اور طلبہ بیٹھے ہوئے تھے اب ایک کہتا ہے کہ، **أنا يفعل، أنا يفعل،** کتنی فحش غلطی ہے انا یفعل وہ چھوٹا بچہ سن رہا ہے تو کہنے لگا بابا، بابا، **ماذا يقول أنا**

یفعل انا یفعل چھوٹا بچہ ہنس رہا ہے یہ کیا کہہ رہا ہے تو یہ جو غلطیاں ہوتی ہیں **نحن نفعلون**، یہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے ہیں لیکن جب آپ طلبہ کو اس طرح محنت کر کے پڑھائیں گے تو ان شاء اللہ کوئی نہیں کہے گا کہ **نحن نفعلون، نفعل** کہے گا۔ **انا افعل انت تفعل الی آخرہ** تو بس ذرا سی محنت کی ضرورت ہے تھوڑی سی توجہ کی، ابتداء میں جب آپ محنت کریں گے تو اس کے بعد آسانی ہو جائے گی پھر آپ کو زیادہ محنت کی بھی ضرورت نہیں ہوگی اس طرح ان کو پڑھنا، بولنا، اور اس کو سمجھنا بھی آ گیا۔

اب لکھنا باقی رہ گیا ہے ہر طالبعلم کے پاس ایک کاپی ہونی چاہئے اور آپ ان سے کہیں یہ جو سبق پڑھایا ہے الدرس الاول مثلاً اپنی کاپی میں کتاب کو دیکھ کر لکھ کر لاؤ عموماً کتاب کے جو خط ہوتے ہیں بڑے خوبصورت ہوتے ہیں آج کل تو کمپیوٹر ہے تو اگر وہ اس کو روزانہ لکھیں گے ان شاء اللہ ان کا خط بھی ٹھیک ہو جائے گا ان کا ہاتھ بھی چلے گا اور وہ جملہ آپ کو یاد ہے جو کہتے ہیں ؎

گر ہمی خواہی کہ باشی خوش نویس می نویس می نویس می نویس

اگر خوش نویس بننا چاہتے ہو تو لکھتے رہو لکھتے رہو ایسے ہی کسی زبان کو بولنا ہے بولتے رہو بولتے رہو اور ان طلبہ کو یہ سمجھاؤ شرمانے کی بات نہیں چاہے غلط بولو، بولو، غلط بولو، بولو اس لئے کہ **الخطاء قنطرۃ الصواب** غلطی کے بعد ہی انسان صحیح بولتا ہے چھوٹا بچہ غلط بولتا ہے لیکن ماں باپ، بہن، بھائی اس کو سکھاتے ہیں پھر اس کی زبان صاف ہو جاتی ہے۔ تو انشاء اللہ جب آپ اس طرح ان کو کہیں گے تو کل وہ آپ کے شاگرد ہونگے دنیا میں بھی بہر حال آپ کے لئے دعائیں کرینگے اور جب ہم یہاں سے جائیں گے پیچھے بھی انشاء اللہ۔ اور جتنی عربی زبان انسان جانتا ہے ہمارے ہاں جتنے علوم ہیں سارے عربی زبان میں ہیں لہذا ان کا سمجھنا بھی بڑا آسان ہوگا موٹی سی مثال ہے جو شخص اردو اچھی طرح جانتا ہے وہ اخبار اٹھا کر پڑھ رہا، سمجھ رہا ہے، کوئی اردو کی کتاب دیکھتا ہے تو سمجھ رہا ہے۔ لیکن اگر کوئی اردو ہی نہیں جانتا تو پھر اس کو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو گویا عربی کا جاننا یہ معین ہے ہمارے علوم کے سمجھنے کے لئے۔ بہر حال اس قسم کے چند محاضرات ہیں جو چھپے ہوئے بھی ہیں اور مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا ورنہ میں اپنے ساتھ لاتا آپ حضرات اپنے اپنے مدرسوں میں سے کسی کو بھیج دیں اور ہمارے پاس جتنے نسخے ہوئے میں انشاء اللہ ضرور بھیجوں گا اور آپ اس کو تفصیل سے پڑھیں آپ کو فائدہ ہوگا اور اگر یہ کم پڑ گئے تو انشاء اللہ عنقریب اس کو ہم دوبارہ چھاپنے والے ہیں تو جتنے آپ کو نسخے

چاہئے ہونگے میری طرف سے آپ کو یہ ہدیہ ہے اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی توفیق دے۔

آپ یقین کریں کاش میرے ذمہ یہ جامعہ کی ذمہ داری نہ ہوتی تو آج بھی میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں صرف مدرس ہوتا اور بس، اور گر میرا تدریس کا سلسلہ جاری ہوتا تو آج یہی طریقہ عصریہ کتاب شاید اور زیادہ مفید ہوتی۔ کیوں کہ مقولہ مشہور ہے کہ مصنف کی زندگی میں کتاب کبھی مکمل نہیں ہوتی جب بار بار انسان پڑھاتا ہے تو اس کے اندر نئی نئی باتیں آتی ہیں تو اس میں اضافہ کرتا ہے۔

بہر حال کہنے کا مقصد یہی ہے کہ هنيئا لكم على هذه المناصب . اللہ کے ہاں یہ بہت اونچا مقام ہے اپنے اس مقام کو پہچانئے اور کبھی اس مقام کو حقیر نہ سمجھئے خدا کی قسم یہ اتنا اونچا مقام ہے کہ دنیا کے سارے مناصب اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

اللہ نے اتنا اونچا مقام آپ کو دیا ہے، آپ اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ کوئی ہمیں گالیاں دیتا ہے، ملاملا کہتا ہے بھونکنے دوان کو، اور آخری بات ایک اور بھی کہہ دوں کہ ایسے لوگوں سے جب آپ کا واسطہ پڑے گا تو آپ ان سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ اللہ نے اس کو فرض کفایہ بنایا ہے دین کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے جو امت کی طرف سے یہ علماء اس کو ادا کر رہے ہیں لیکن انسانوں کے دستور اور قوانین میں بھی یہ ہمارا حق ہے یو، این، او، اقوام متحدہ کا جو دستور ہے جس پر ہر ملک نے ہر ممبر نے دستخط کئے ہیں اس کے آرٹیکل اٹھارہ میں صاف لکھا ہوا ہے اس دنیا کے رہنے والے ہر شخص کو اپنے دین کے پڑھنے پڑھانے نشر واشاعت اس پر عمل کرنے کی آزادی ہے اسی بنا پر آج یہودی اپنا بگڑا ہوا یہودی مذہب پڑھا رہا ہے، عیسائی اپنا مذہب پڑھا رہا ہے، ہندو پڑھا رہا ہے، کیا یہ حق مسلمان کو نہیں ہے؟ ہم اپنا دین نہیں پڑھا سکتے؟ یہ کون سا انصاف ہے؟ حالانکہ یہ وہ ادیان ہیں جو انسانیت کے لئے مصیبت ہیں یہودی دین میں ہے کہ یہودیوں کے علاوہ جتنی بھی مخلوق ہے نجس ہے اس لئے ان کا مال، جان، عزت لوٹنا سب تمہارے لئے جائز ہے۔

پچھلے دنوں میں آپ کو معلوم ہوگا کہ غزہ پر آگ برسا رہے تھے ان کا مفتی کہتا ہے تم فلسطینیوں کی عورتیں بوڑھے بچے سب کو مار سکتے ہو تو اسے کوئی نہیں کہتا کہ تم اپنے نصاب میں تبدیلی کرو، تم یہ کرو، تم یہ کرو اور وہاں ٹریننگ بھی دی جاتی ہے انہیں کوئی نہیں کہتا۔ لے دے کے ہمارے پیچھے پڑے ہوئے

ہیں تم مدرسوں میں یہ کرو، یہ کرو، یہ کرو، ٹھیک ہے ہمارے مدرسے ہیں ہمارے مدرسے ہیں ہماری تنظیمیں ہیں ہمارے یہاں نصاب کی کمیٹیاں ہیں وہ سب کچھ جو ہم مناسب سمجھتے ہیں کرتے ہیں تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہمیں آ کے تم یہ بتاؤ۔ کیا کوئی آدمی جا کے میڈیکل کالج میں پرنسپل سے کہتا ہے کہ پرنسپل صاحب آپ اس کے اندر یہ ڈال دو، یہ ڈال دو، یہ ڈال دو، جوتے مار کے باہر نکالیں گے تو بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے امت کا جو علماء ادا کر رہے ہیں اور ہمارا حق ہے۔ پاکستان کے دستور کے اندر بھی آرٹیکل بیس میں لکھا ہوا ہے کہ پاکستان کے اندر رہنے والے ہر شخص کو اپنے دین کی آزادی ہے ہندو کو ہے عیسائی، یہودی، سب کو تو کیا ہمیں آزادی نہیں ہے؟ ہم اپنا دین پڑھیں اور پڑھائیں اور اس کی نشر واشاعت کریں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں اور ان فتنوں سے ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆......☆......☆

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۳ مئی ۲۰۱۰ء بروز جمعرات، دوپہر ۱ بجے﴾

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبین.

حضرات اساتذہ کرام، برادران عزیز اور محترم معلمات، میری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

وقت تھوڑا ہے باتیں تو بہت سی کرنے کی ہوتی ہیں اور الحمد للہ اب تک مختلف حضرات کافی اہم ہدایات آپ حضرات کے سامنے لا چکے ہیں۔ مزید بھی کچھ آئیں گی اس تھوڑے وقت میں جتنی بات میں کہہ سکوں گا کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں آجائیں۔

پہلی بات جس کا اثر آج کل طبیعت پر بہت زیادہ ہے۔ اور آج کل جب میں مدرسوں میں جاتا ہوں تو یہ بات کہتا ہوں۔ اور دارالعلوم میں بھی اپنے اساتذہ کرام سے کہا کرتا ہوں یا کہتا رہتا ہوں کہ الحمد للہ ہمارے دینی مدارس میں تعلیم بنسبت سرکاری تعلیمی اداروں کے بدرجہا بہتر ہے۔ ان کے ہاں تو تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔ تعلیم تو ہمارے مدرسوں میں ہی ہو رہی ہے الحمد للہ۔ اساتذہ بھی محنت کرتے ہیں۔ طلبہ بھی محنت کرتے ہیں۔ الحمد للہ ہمارے مدارس میں جو معیاری مدرسے ہیں ان میں تعلیم اچھی خاصی ہو رہی ہے۔ اس کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے اور بہت کچھ اصلاحات اور اضافوں کی ضرورت بھی ہے۔ وہ سب باتیں آتی رہتی ہیں وفاق میں بھی زیر غور آتی ہیں، اور ان محاضرات میں بھی آپ حضرات کے سامنے آئی ہونگی۔ لیکن جس چیز کا میں بہت بڑا خلا محسوس کر رہا ہوں اور اس کی وجہ سے بہت تشویش ہے، وہ یہ کہ

ہم اپنے مدارس میں دین پڑھا تو رہے ہیں، سکھا نہیں رہے۔ یہ بہت اہم لمحہ فکریہ ہے۔ ہم دین پڑھا رہے ہیں سکھا نہیں رہے۔ اور یہ بہت بڑا المیہ ہے۔

ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یاسین صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند کے ہم عمر تھے یعنی جس سال دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی اسی سال یا اس سے کچھ مہینے پہلے یا بعد ہمارے حضرت دادا رحمہ اللہ کی ولادت ہوئی تھی تو وہ تقریباً دارالعلوم دیوبند کے ہم عمر تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے عاشق زار اور مرید خاص تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ کے ہم سبق تھے۔ اور دونوں نے دورہ حدیث بھی ایک ساتھ کیا۔

ان کا ایک ملفوظ میں نے اپنے والد صاحب سے بار بار سنا، فرماتے تھے کہ

میں نے دارالعلوم دیوبند کا وہ دور دیکھا ہے کہ جب یہاں کے صدر مدرس اور مہتمم سے لے کر چپڑاسی اور دربان تک سب صاحب نسبت ولی اللہ ہوتے تھے۔

میں نے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات بھی سنی ہے کہ

دارالعلوم دیوبند دن میں درس گاہ ہوتا تھا اور رات کو خانقاہ بن جاتا تھا

وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ایک لازمی حصہ تھی۔ ہر استاد بھی اسکی ضرورت سمجھ کر اس کا اہتمام کرتا تھا اور طلبہ بھی اس کوشش میں لگتے تھے۔ ذہن بنایا جاتا تھا۔ دیوبند کے علماء اور بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے اتباع سنت کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ انہوں نے اس بات کو سمجھا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے مقاصد بعثت قرآن کریم میں چار بیان کئے گئے ہیں:

﴿يَتْلُوا عليهم آياتِهِ ويُزَكِّيهِم ويُعَلِّمُهُم الكِتابَ والحِكمَةَ﴾

ان میں تین چیزیں تو تعلیم سے متعلق ہیں:

(۱) تلاوتِ آیات یعنی تعلیم الفاظ قرآن، جو مکاتب قرآنی میں ہمارے ہاں ہو رہی ہے۔

(۲) تعلیم کتاب: یعنی قرآن کے معانی کی تعلیم، اس کا دینی مدارس کے درس نظامی میں کام ہو رہا ہے۔

(۳) والحکمۃ: حکمت سے مراد جمہور کے نزدیک سنت ہے، سنت کی تعلیم جو دارالعلوموں میں ہو رہی ہے۔ الفاظ قرآن کی تعلیم، معانی قرآن کی تعلیم اور سنت نبوی ﷺ کی تعلیم ان تین چیزوں کا حاصل کیا نکلا؟ تعلیم! تو چار مقاصد جو ہیں ان میں تین کام تو تعلیم ہی سے متعلق ہیں۔

(۴) چوتھی چیز ہے: یزکیھم اس کا تعلق تربیت سے ہے کہ آپ، لوگوں کو برے عقائد سے، برے اعمال سے، برے اخلاق سے، پاک کرتے ہیں، یہ تربیت ہے۔ تو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت

رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی قرار دیا گیا ہے۔علماء کرام ورثۃ الانبیاء ہیں اور وارث کا حصہ مورث کے پورے ترکہ میں اس کے ایک ایک پرزے میں، ایک ایک سوئی تک میں ہوتا ہے۔ مورث نے جو کچھ ترکہ چھوڑا ہے اس کے ذرہ ذرہ میں اور اگر اس نے کوئی دوا بھی چھوڑی ہے جو کھاتے کھاتے باقی بچ گئی ہے مورث سے، اس کے اندر بھی وارثوں کا حصہ ہے۔کوئی سوئی بھی چھوڑی ہے تو وہ بھی مشترک ہے، وارث کا حصہ ہے۔

تعلیم انبیائے کرام علیہم السلام کی میراث ہے جو علماء کو ملی ہے۔ تربیت بھی میراث ہے حضور ﷺ کی، تو ہمارا فرض منصبی جس طرح تعلیم ہے اسی طرح تربیت بھی ہے۔

اور بزرگان دیوبند نے اس حقیقت کو سمجھا تھا اس واسطے وہاں تعلیم وتربیت دونوں ہو رہی تھیں۔اور اس کا حال آپ نے یہ دیکھا کہ تمام صاحب نسبت ولی اللہ ہوتے تھے جب اساتذہ ایسے تھے تو طلبہ تو ان کو دیکھ دیکھ کر ہی سیکھیں گے۔ خوب سمجھ لیجئے تربیت تقریروں سے نہیں ہو سکتی۔ وعظ ونصیحت سے نہیں ہو سکتی۔ کتابوں اور مضامین سے نہیں ہو سکتی۔ محاضرات سے نہیں ہو سکتی۔

تربیت تو عملی طور پر مشق کرانے سے ہوتی ہے۔ مشق کرنے سے ہوتی ہے۔

ہم نے اور آپ نے نماز پڑھنا، یہ بتائیے کتاب سے سیکھا ہے یا اپنے بزرگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر یا مسجد میں نمازیوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر سیکھا ہے؟ آپ غور فرمائیے۔ کیا ہم میں سے کسی نے صرف کتاب پڑھ کر نماز سیکھی ہے؟ کتاب سے ہمیں مسائل کی تفصیل جاننے کے لئے مدد تو ضرور ملی مگر رکوع کس طرح ہوگا؟ سجدہ کس طرح ہوگا؟ قیام، قومہ کس طرح ہوگا؟ قعدہ کس طرح ہوگا؟ یہ سب باتیں ہم نے عملی طور پر دیکھنے سے سیکھی ہیں۔ تو کتاب سے تعلیم ہوتی ہے تربیت نہیں ہوتی۔ تربیت کے لئے تو تربیت کرنی پڑتی ہے۔ آج بھی اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کی ایک تھیوری پڑھائی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد لیب میں اس کی ٹریننگ کرائی جاتی ہے۔ ہمارے مدرسے! افسوس ہے افسوس ہے، موجودہ ماحول میں تربیت سے تقریباً خالی ہو گئے ہیں۔

جن مدرسوں میں اچھی خاصی معیاری تعلیم ہو بھی رہی ہے۔ وہاں بھی تربیت کا تقریباً فقدان ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔ اور علماء کی اور مدرسوں کی تعداد اتنی

زیادہ ہے۔ اس کے باوجود معاشرے پر علماء کے اثرات اور علماء کی گرفت روز بروز کمزور اور ڈھیلی ہوتی جارہی ہے اور معاشرہ متاثر نہیں ہورہا، معاشرہ علماء سے رہنمائی نہیں لے رہا۔ سامنے کے جو گنے چنے معتقدین ہیں، یہ تھوڑا سا ایک طبقہ ہے بیچاروں کا یہ تو ہم آپ کے ساتھ دین کے کاموں میں ویسے بھی لگا ہوا ہے۔ ہمیں اس پر مطمئن نہیں ہونا چاہئے کہ ہاتھ چومنے والے ہمارے بہت سارے ہیں۔ اور وہ جو پورا معاشرہ ہے؟

چودہ کروڑ انسانوں کا معاشرہ، یہ ہم سے متاثر نہیں ہو رہا۔ کیوں کہ ہمارا عملی نمونہ صحیح نہیں ہے۔

ہمارے طلبہ کا طرز زندگی قابل اطمینان نہیں ہے۔ قابل اقتداء نہیں ہے۔ اور وہی طلبہ کچھ عرصہ کے بعد عالم بن جاتے ہیں۔ ان کا طرز عمل ایسا نہیں ہے جو دوسروں کو متاثر کر سکے۔

گاڑی چلانے کی ٹریننگ آپ نے دیکھی، یہ بتلائیے کہ اگر گاڑی چلانے کا مکمل طریقہ کسی کتاب میں لکھ دیا جائے۔ اور تصویریں بنا بنا کر دکھا دیا جائے کہ یہ کلچ ہے یہ اسٹارٹر ہے، یہ اسٹیرنگ ہے، یہ بریک ہے اور یہ فلاں ہے اور یہ فلاں ہے۔ اور پہلے یوں ہوگا پھر یوں ہوگا پھر یوں ہوگا اور کون سا گیئر کس طریقہ سے کب بدلا جائے گا اور کس طریقے سے ہوگا؟ سارا آپ کو کتاب میں پڑھا دیا جائے۔ اور سمجھا بھی دیا جائے۔ پھر حفظ بھی کروا دیا جائے۔ امتحان بھی لے لیا جائے۔ اور اس کے اندر آپ کو پہلی پوزیشن بھی مل جائے۔ لیکن آپ سے کہا جائے کہ گاڑی چلائیے اگر اس سے پہلے آپ نے گاڑی چلائی نہیں ہے تو میں تو آپ کی گاڑی میں بیٹھنے کے لئے تیار نہیں ہونگا اور اگر بیمہ بھی کرا رکھا ہوگا تب بھی نہیں بیٹھوں گا۔ کیوں کہ آپ نے گاڑی چلانا پڑھا ہے۔ سیکھا نہیں ہے۔ بالکل یہی حالت ہماری ہے۔ الحمدللہ علم ہمارے پاس محفوظ ہے۔ احادیث اور قرآن کی تفاسیر جو بزرگوں سے چلی آرہی ہیں پندرہ سو سال سے تقریباً ہمارے پاس محفوظ ہیں لیکن عمل نہیں رہا۔ علم پر عمل کا طریقہ نہیں رہا۔ لوگ ہمارے اوپر اسی وجہ سے اعتماد نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس کتاب تو بہت اچھی ہے، بالکل برحق ہے۔ لیکن یہ خود عمل نہیں کر سکتے۔

اور یہ بات میں بہت دکھے ہوئے دل سے کہہ رہا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو ہمارے ہاں

ماں باپ اپنے بچوں کو سکھا دیتے تھے۔گود میں بچہ سیکھنا شروع کر دیتا تھا، جب ناظرہ قرآن پڑھنے مدرسہ میں آتا تھا تو وہاں اسکی مزید تربیت ہو جاتی تھی اور اساتذہ مکتب میں سکھا دیتے تھے یہاں تک کی تعلیم وتربیت ہمارے طلبہ کے پاس نہیں رہی اور اوپر بڑے درجات میں آ کر تو اور بھی تربیت کا فقدان ہو جاتا ہے۔اساتذہ کتاب کے اندر تو خوب زور لگا دیتے ہیں دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں۔لیکن اس طرف نظر نہیں رکھی جاتی کہ دین پر عمل کتنا ہو رہا ہے۔اماطة الاذیٰ عن الطریق کی حدیث تو سنائیں گے افشاء السلام کی حدیث بھی سنائیں گے لیکن عمل نہیں ہو رہا ہوگا۔

حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ دیوبند میں ہمارے والد صاحبؒ کے استاذ تھے، میں نے بار بار الحمدللہ ان کی زیارت کی ہے۔ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کو ابتداء بالسلام کوئی کر نہیں سکتا تھا۔طلبہ طے کر کے نکلتے تھے کہ آج ہم ابتداء بالسلام کریں گے، استاد کو سلام کرنے میں پہل کریں گے لیکن وہ موقع نہیں دیتے تھے جہاں نظر پڑی فوراً السلام علیکم، نظر پڑی، السلام علیکم طالبعلم مل رہے ہیں، بچے مل رہے ہیں، چھوٹا مل رہا ہے بڑا مل رہا ہے السلام علیکم یہ ہمارے ان بزرگوں کا طریقہ تھا۔

اب ہمارے یہاں مصافحہ بازی کا تو بڑا زور ہے۔مصافحہ کے لئے تو کہنی بھی ماریں گے دھکے بھی دیں گے اور جس سے مصافحہ کیا جا رہا ہے اگر اس کے پاس مصافحہ کا وقت نہ بھی ہو، تب بھی مصافحہ کریں گے۔لیکن ابتداء بالسلام کا اہتمام نہیں ہے۔

اور اگر ہم طالب علم کو سلام کر لیں تو وہ جواب نہیں دیتے، اچھا ایک بات اور بھی ہے ہم طالبعلم کو سلام کرتے ہیں تو شاید طالبعلم شرماتا ہے کہ ابتداء بالسلام تو مجھے کرنی چاہئے تھی مگر ابتداء کر دی استاد نے، تو شرم کے مارے جواب نہیں دیتے۔میں اس سے مواخذہ کرتا ہوں کہ تم نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے تمہارا کیا قصور کیا تھا؟

ایک صحابی نے جا کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو سلام کیا وہ اس وقت کسی غور وفکر میں تھے اور سلام کرنے والے نے یہ سمجھا کہ یہ مجھے دیکھ رہے ہیں مگر وہ اس وقت غور وفکر میں تھے انہوں نے سلام کو سنا نہیں۔وہ جو دیکھ رہے تھے درحقیقت دھیان ان کا کسی اور چیز کی طرف تھا۔حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جواب نہیں دیا تو انہوں نے جا کر امیر المؤمنین سے شکایت کی اور کہا کہ میں نے (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ

کو سلام کیا اور وہ مجھے دیکھ بھی رہے تھے مگر انہوں نے مجھے سلام کا جواب نہیں دیا امیر المؤمنین نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو طلب کر لیا کہ انہوں نے تمہیں سلام کیا تھا تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟ تو انہوں نے کہا کہ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ انہوں نے مجھے سلام کیا!

اب اگر میں کسی طالبعلم کو سلام کرتا ہوں وہ جواب نہیں دیتا تو میں اس سے مواخذہ کرتا ہوں کہ تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے کیا قصور کیا تمہارا؟ میرا حق تھا تمہارے اوپر کہ تم میرے سلام کا جواب دو۔

اچھا! اب ہوتا کیا ہے کہ مصافحہ تو کریں گے لیکن نہ سلام کریں گے نہ سلام کا جواب دیں گے اور اب تو یہ ہمارے مدرسوں میں ہو رہا ہے، کہنیاں مار مار کے بزرگوں سے مصافحہ کریں گے۔ دھکے دے دے کر مصافحہ کریں گے۔ اور ان بزرگ کے آنے جانے کا راستہ بند کر دیں گے جب تک مصافحہ نہ کر لیں۔ یہ عوام کی باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ مدرسوں کے طلبہ کی بات کر رہا ہوں۔ مسجدوں کے اندر میرے سامنے ہوتا ہے۔

میں اپنی کیا بات کہوں۔ ہمارے دار العلوم کے ایک افغانی طالب علم تھے، گزشتہ سال فارغ ہوئے۔ ایک جگہ تمام مدارس کے ممتحنین جمع تھے۔ ممتحنین مدرسوں کی کریم ہوتے ہیں۔ وفاق المدارس کے (امتحانات میں) پورے ملک کے طلبہ کے نمبر لگاتے ہیں۔ ان ممتحنین کا کئی دن اجتماع رہا۔ وہ افغانی طالبعلم مجھ سے کہنے لگا کہ حضرت مجھے تو بڑا افسوس ہوا ان حضرات کو دیکھ کر۔ ان میں سے بعض لوگ تو نمازی کے سامنے سے گزر جاتے ہیں، اور بعض ان میں سے تخطئی رقاب کر کے (یعنی) گردنوں کو پھلانگ کر آگے بڑھتے ہیں اور بعض ان میں سے سنتیں پڑھنے کے لئے سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آگے جگہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ پیچھے کھڑے ہوئے ہیں۔ سنتیں پڑھ رہے ہیں نفلیں پڑھ رہے ہیں، آگے والوں کا راستہ روک دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی تربیت ہی نہیں ہوئی!۔ اور یہ کون کہہ رہا تھا طالبعلم کہہ رہا تھا طالبعلم!۔ یہ خوف ناک بات ہے۔

آج جو پورے معاشرے میں ہماری بات کی شنوائی نہیں، ہماری بات کا اثر نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کو تہذیب و شائستگی تک نہیں آتی۔ مصافحہ کے ان کو آداب نہیں آتے۔ اگر کسی سے مصافحہ کرو تو بھائی! فرصت بھی دیکھو دوسرے آدمی کا ہاتھ بندھا ہوا ہے یا ہاتھ میں سامان

ہے۔ اور وہ مصافحہ کے لئے زور لگا ئیں کہ مصافحہ کرو۔ مطلب یہ کہ ہمارے سامان رکھ کر جگہ تو دو پھر مصافحہ کرو۔

یہ باتیں ہمارے مدارس کے طلبہ کو نہیں سکھائی جارہی ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں نمازی کے برابر میں آکر بیٹھ جائینگے۔ جس سے مصافحہ کرنا ہے وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور ان کو مصافحہ کرنا ہے، ایک ادھر بیٹھا ہے ایک ادھر بیٹھا ہے۔ کراما کاتبین! اچھا اور اب اس فکر میں ہیں کہ جیسے ہی یہ سلام پھیرے گا تو فوراً سلام اور مصافحہ کریں گے۔ سلام کریں نہ کریں مصافحہ تو فوراً ہی کریں گے خیر! مگر اس نے رعایت کی کہ پہلا سلام پھیرنے پر مصافحہ نہیں کیا۔ جب دوسرا سلام پھیرا۔ ابھی سلام پورا بھی نہیں ہوا کہ اس نے فوراً السلام علیکم کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ عام طور پر میں جب تک سلام نہ پھیرلوں سلام اور مصافحہ نہیں کرتا لیکن اس دن میں نے سلام بھی پھیر دیا اور اس نے سلام کیا تو میں نے اس کا جواب بھی دے دیا اور مصافحہ بھی کرلیا۔ اب یاد آیا کہ میرے ذمہ تو سجدۂ سہو تھا! چار رکعت والی نماز تھی۔ اس طرح سے ستاتے ہیں یہ لوگ۔

حضرت تھانویؒ نے آدابِ المعاشرت میں لکھا ہے کہ اگر کسی سے آپ کو بات کرنی ہے اور وہ نماز پڑھ رہا ہے تو ایسی جگہ بیٹھو کہ نماز پڑھنے والے کو پتہ نہیں چلے کہ آپ اس کے انتظار میں ہیں ورنہ اس کے دل میں تشویش پیدا ہوگی پتہ نہیں کیا ایمرجنسی کی خبر لے کر آیا ہے۔ کیوں آیا ہے؟ کیا بات ہے؟ تو یہ سب باتیں سیکھنے سکھانے کی ہوتی ہیں لیکن ہمارے مدرسوں میں ان چیزوں کو نہیں سکھایا جارہا۔ بڑی پریشانی جو ہے وہ اس بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس طرف توجہ کرنے کی توفیق دے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ اور اس کو کرنے کی ضرورت ہے۔

آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا ہے، اُس زمانے میں وہ فرماتے تھے کہ تیس سال سے

ہمارے مدارس عقیم ہوگئے ہیں، بانجھ ہوگئے ہیں ان میں اب کوئی مولوی پیدا نہیں ہوتا۔

علامہ پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا بھی پیدا ہوتے ہیں طرح طرح کے القاب والے لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں مولوی پیدا نہیں ہوتا۔ مولوی اس میں "ی" نسبت کی ہے مولا کی طرف۔ مولوی ہے یہ لفظ،

مولا والا، اللہ والا؛ جیسے حضرت مولوی معنوی:

علم مولا ہو جسے ہے مولوی   جیسے حضرت ! مولوی معنوی

تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہمارے مدرسوں میں مولوی پیدا نہیں ہو رہے۔علامہ پیدا ہوجاتے ہیں۔مولانا پیدا ہوجاتے ہیں۔لیکن اللہ والے لوگ پیدا نہیں ہو رہے۔وہی جو صاحب نسبت اولیاء اللہ ہوتے تھے۔جو دیوبند سے پیدا ہوا کرتے تھے۔اب ہمارے مدرسوں سے پیدا نہیں ہو رہے الاّ ماشاء اللہ۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے اگر میرے اس دارالعلوم سے پوری دارالعلوم کی زندگی میں ایک مولوی بھی پیدا ہوگیا تو میں سمجھوں گا کہ دارالعلوم کی قیمت وصول ہوگئی۔تو بھئی اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

علامہ اور مولانا بننے سے پہلے مولوی بننے کی کوشش کی جائے۔اور اپنے طلبہ کو مولوی بنانے کی کوشش کی جائے۔

لیکن پہلی بات یہ ہے کہ پہلے تو خود کو بنایئے، جب تک خود کو نہ بنایا جائے گا تو طلبہ کو آپ نہیں بنا سکتے۔اپنی تعمیر کیجئے! طلبہ کی تعمیر خود بخود ہوجائے گی۔آپ کے ذریعہ سے، آپ کے طرزِ زندگی کو دیکھ کر ہوجائے گی۔ایک بات اور ہے اس پر بھی بڑی توجہ کی ضرورت ہے:

الحمد للہ اس پر بار بار بات کی جاتی ہے کہ اتباعِ سنت بہت ضروری ہے۔سنت کی پیروی کرنی چاہئے۔لیکن ہمارے یہاں افسوس ناک بات یہ ہے کہ سنت کا لفظ اور مفہوم اتنا محدود کرلیا گیا ہے کہ چند سنتوں کے اوپر عمل کرنے والے کو سمجھا جاتا ہے کہ یہ متبع سنت ہے۔

جاہلوں نے تو یہاں تک کردیا کہ اگر کسی نے ڈاڑھی رکھ لی تو اس کو کہتے ہیں کہ باشرع ہے اور ڈاڑھی نہیں رکھی تو بے شرع ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ ساری شریعت سمٹ کر ڈاڑھی میں آ گئی اگر کسی نے ڈاڑھی رکھ لی تو وہ باشرع ہوگیا چاہے وہ سود کھاتا ہو، جھوٹ بولتا ہو، دھوکہ بازیاں کرتا ہو، بداخلاقیاں کرتا ہو، حرام کھاتا ہو مگر چونکہ ڈاڑھی رکھ لی تو باشرع ہے۔یہ عوامی اصطلاح کی باتیں کر رہا ہوں۔ الحمد للہ یہ جہالت کی بات ہمارے مدرسوں میں نہیں ہے۔عوام میں تو یہ بات ہے کہ ان کے نزدیک ڈاڑھی کے اندر سارا دین سمٹ کر آ گیا حق اور باطل کا سارا مدار ڈاڑھی پر آ گیا۔ڈاڑھی رکھ لی تو وہ چور بھی ہوگا تو باشرع ہے۔ڈاکو ہوگا تو تب بھی باشرع ہے۔العیاذ باللہ۔خیر وہ تو عوام کی بات ہے۔

لیکن ہمارے دینی مدرسوں کے اندر بھی جب اتباعِ سنت کی بات آتی ہے۔ تو چند چیزیں ذہنوں میں آجاتی ہیں۔ سنت کے مطابق ڈاڑھی رکھی ہوگی، ٹخنے سے اونچا پاجامہ ہوگا۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھیں گے واپسی میں اس کے برعکس ہوگا، اسی طرح کھانا کھاتے ہوئے بسم اللہ پڑھ لی، سر پر ٹوپی اوڑھ لی، چند سنتیں ہیں ان پر عمل کرلیا تو ہاں بھئی متبعِ سنت ہے، سنت پر عمل ہو رہا ہے۔ سلام کرلیا، سلام کا جواب دے دیا۔

لیکن سنت تو رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ زندگی کا نام ہے۔ سنت کہتے ہی اس طریقہ کو ہیں، رسول اللہ ﷺ کا طریقۂ زندگی کیا تھا؟ آپ گھر میں کس طرح اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پیش آتے تھے؟ اور پڑوسیوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ کیا تھا۔ آپ کے کھانے پینے کا انداز کیا تھا؟ کس طرح کھاتے تھے، کس طرح پیتے تھے، کس طرح چلتے تھے، کس طرح بولتے تھے، کس طرح پہنتے تھے؟ دوستوں سے کس طرح پیش آتے تھے۔ دشمنوں سے کس طرح پیش آتے تھے؟ بچوں سے کس طرح شفقت فرماتے تھے۔ عورتوں کی دل داری کس طرح فرماتے تھے؟ جہاد کس طرح فرماتے تھے۔ عبادت کس طرح کرتے تھے؟ اور انتظام حکومت کس طرح چلاتے تھے۔ تجارت کی تو کس طرح سے تجارت کی تھی؟ مزدوری کی تھی، جب بکریاں چراتے تھے تو اس وقت آپ کا طریقہ زندگی کیا تھا؟ یہ ساری زندگی، اس پورے طرزِ زندگی کا نام سنت رسول ﷺ ہے۔ اور ہمارے یہاں تو سنت کی بعض چیزوں پر عمل کردیا۔ مثلاً اماطة الاذیٰ عن الطریق کی سنت پر تو ہمارے مدرسوں میں عمل ہی نہیں ہو رہا آپ نے پڑھا ہے:

﴿الایمان بضع وستون شعبة﴾ ایمان کے ستر سے اوپر شعبے ہیں:

﴿افضلها لا اله الا الله وان محمدا الرسول الله وادناها اماطة الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبة عظیمة من الایمان﴾

اماطة الاذیٰ آج ہمارے یہاں اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور اس پر کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔ اتنے بڑے پیمانے پر یہ منکر پھیل رہا ہے۔ ہمارے مدرسوں کے اندر میں طلبہ کو دیکھتا ہوں۔ میں نے خود دارالعلوم میں تجربہ کیا پرانے دارالحدیث کے پاس ایک بلاک پڑا ہوا تھا اور نظر آتا تھا

کہ آدمی اگر اس سے بچ کر چلے تو ٹھوکر نہیں کھائے گا لیکن اگر اندھیرے میں آئے تو ہوسکتا تھا کہ ٹھوکر بھی کھا جائے تو میں نے سوچا کہ اس کو ہٹاؤں، طبیعت کچھ ایسی ہے کہ کوئی چیز اگر غلط پڑی ہوئی ہے تو اسکو ہٹائے بغیر چین نہیں آتا، یا تو خود ہٹاؤں یا کسی سے ہٹواؤں، میں نے سوچا کہ نہیں چلو آج نہیں ہٹاتا، دیکھوں کہ اسکو کوئی ہٹاتا ہے یا نہیں ہٹاتا؟...... میں اپنے ہی لوگوں کی چغلی کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے! لیکن میں دکھے دل سے کہہ رہا ہوں کہ مولوی صاحب! ایک مہینہ گزر گیا اس بلاک کو کسی نے نہیں ہٹایا جو بے جگہ پڑا ہوا تھا تو پھر میں نے ان لوگوں سے درخواست کی۔ یہ ہمارے مدرسوں کا مزاج بن رہا ہے۔

خواتین کی تربیت کا مسئلہ یہ ہے کہ الحمد للہ کہ ان کی بھی تعلیم تو ہو رہی ہے لیکن تربیت کا فقدان وہاں بھی نظر آتا ہے اور ایک بات عام طور سے میں اس طرف معلمات کی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری طالبات میں ایک مزاج یہ بن رہا ہے جسکی شکایت لوگ کرتے ہیں، اور میں نے بھی بعض جگہوں پر ایسا محسوس کیا کہ ہماری طالبات کے مزاج میں علمِ دین حاصل کر کے کچھ بڑائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ ہم عالمات ہیں۔ اس کے بعد اپنے خاندان کی دوسری عورتوں کو وہ ادنیٰ سمجھنے لگتی ہیں۔ بہن بھائیوں کے ساتھ ان کا وہ انداز نہیں رہتا جو پہلے تھا، سسرال میں جا کر شوہر کے ساتھ اور سسرال (والوں) کے ساتھ انکساری اور تواضع اور خدمت گزاری جو ہماری مشرقی خواتین اور مسلم خواتین کا ایک لازمی حصہ ہے کہ اپنے شوہر کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔ اپنے شوہر کے رشتہ داروں کی عزت بھی کرتی ہیں۔ حتی الامکان ان کی راحت رسانی کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ، اپنے ماں باپ کے ساتھ ان کی خدمت گزاری معروف ہے، ہماری بچیاں اپنے ماں باپ کی کتنی خدمت کرتی ہیں۔

لیکن ہمیں اطلاعات کچھ ایسی مل رہی ہیں کہ عالمہ بننے کے بعد یا عالمہ بننے کے زمانے ہی میں ان کے مزاجوں میں یہ بڑائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پہلے جیسی خدمت گزاری ان کی ماں باپ کے ساتھ نہیں رہتی، پہلے جیسا طرزِ عمل اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ نہیں رہتا۔ رشتہ داروں کے ساتھ نہیں رہتا۔ شادی ہونے کے بعد جب سسرال میں جاتی ہیں تو وہاں شوہر کے اوپر بھی اگر وہ بیچارہ عالم دین نہیں، تو حکومت چلاتی ہیں، اور اس کو حقیر سمجھتی ہیں۔ ان چیزوں کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

ان معلمات سے میری درخواست ہے کہ اپنی طالبات کے اندر تواضع، انکساری اور خدمت گزاری کے جو جذبات ہماری مشرقی خواتین کے امتیاز ہیں۔ اور مسلم خواتین کے امتیاز ہیں۔ اس کو زندہ رکھیں، اس کو کمزور نہ ہونے دیں۔

یہ ہماری عورتوں کا قیمتی اثاثہ ہے ہماری مشرقی خواتین کتنے ایثار سے کام لیتی ہیں اپنے شوہروں کے ساتھ، اپنے رشتہ داروں کے ساتھ، سسرال میں بھی اس ایثار کی حفاظت کرنی ہے اس کو باقی رکھنا ہے۔ اگر چہ سسرال والوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی بہو سے خدمت لیں۔ ساس سسر کو کوئی حق نہیں ہے کہ زبردستی بہو سے خدمت لیں، لیکن بہو کی قابل تعریف بات یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ میرے شوہر کے ماں اور باپ ہیں۔ جب یہ میرے شوہر کے ماں اور باپ ہیں تو میرے لئے بھی ماں باپ کی طرح ہیں۔ ان کی عزت واحترام میں کمی نہ کرے۔ اور جتنی خدمت وہ کرسکتی ہے کرے۔ لیکن ہاں ساس سسر کو، دیور نندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ زبردستی اس سے کام لیں، یہ سب باتیں عورتوں کو سکھانے کی ہیں۔ ابھی ان معلمات میں سے کچھ ساس بھی ہونگی، کچھ نندیں بھی ہونگی اور کچھ بہوئیں بھی ہونگی، کچھ بیٹیاں بھی ہونگی اور پھر ان کی طالبات بھی اسی طریقہ سے ہیں۔ ان کو سکھانے کی ضرورت ہے۔

یہ جو بعض اوقات ہمارے خاندانوں میں (بلکہ) ہمارے معاشرے میں ایک مصیبت ہوگئی ہے کہ ساس بہو پر حکومت چلاتی ہے اور خود بادشاہ بن کر یا شہزادی بن کر یا رانی بن کر مسلط ہوجاتی ہے کہ ساری خدمت کی ذمہ داری اس بہو کے اوپر! دیور کا حکم بھی اسی پر چلتا ہے۔ نندوں کا حکم بھی اسی پر چلتا ہے۔ ذرا سی کسی چیز میں بھول چوک ہوجائے تو سارے اعتراضات اس پر ہوجاتے ہیں۔ گویا ایک باندی، خادمہ گھر میں آگئی ہے اس سے جتنی چاہو خدمت لےلو اور جتنی چاہو اس کے ساتھ بدتہذیبی کے معاملات کرتے رہو، یہ باتیں بھی ہمارے مدرسوں میں سکھانے کی ضرورت ہے کہ اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ معاشرت میں اللہ تعالیٰ نے جس کے جتنے درجہ رکھے ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں، ماں باپ کا اپنی جگہ پر حق ہے، بیوی کا اپنی جگہ پر حق ہے، شوہر کا اپنی جگہ پر حق ہے۔

ادھر ہم ایک بات اور بھی دیکھتے ہیں جب بھی بات ہوگی تو اس کا تو ذکر آئے گا کہ بیوی پر شوہر کے حقوق کیا ہیں؟ لیکن

ہماری تقریروں میں، مواعظ میں خدا کے لئے کبھی اس کا بھی ذکر کر دیا کریں کہ مردوں کے اوپر اپنی بیویوں کے کیا حقوق ہیں۔ عورتوں کے کیا حقوق ہیں؟ ہماری تقریروں اور وعظوں میں یہ ذکر نہیں آتا۔

بتایئے پھر خواتین ہماری باتوں کو کیوں توجہ سے سنیں گی۔ آج اتنا بڑا ظلم پورے ملک میں ہو رہا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں خاص طور پر زیادہ ہو رہا ہے کہ عورتوں کو میراث ہی نہیں ملتی۔ سندھ میں نہیں ملتی پنجاب میں، سرحد میں کہیں عورتوں کو میراث نہیں دی جا رہی، ظلم ہے یا نہیں ہے؟

اللہ رب العالمین نے اپنی کتاب قرآن کریم میں صراحۃً حصے مقرر کر دیے۔ ماں کے، بیٹی کے، بیوی کے، تو ان حصوں کو غصب کیا جا رہا ہے۔ لیکن کبھی آپ نے کوئی تقریر سنی ہمارے علماء کی، ہمارے بزرگوں کی، خطیبوں کی؟ کبھی اس منکر کے خلاف بھی آواز اٹھائیں۔ اور عورتوں کے حقوق کی بات بھی کریں۔ تو آج اگر ہماری بات کا اثر نہیں ہو رہا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ

دین کے کام کی جو ہماری ذمہ داری تھی وہ ہم نہیں کر رہے۔

ہم نے درس وتدریس کو ایک پیشہ سمجھ لیا بس سبق پڑھا دو اور پھر طالبعلم اور استاد کا اور طالبہ اور معلمہ کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں رہتا۔

میری گزارشات کا جو خلاصہ ہے وہ یہ ہے کہ دین پڑھانے کے ساتھ ساتھ سکھانا بھی شروع کریں ہم نے ابھی تک سکھانا شروع نہیں کیا۔ دیوبند میں سکھایا جاتا تھا۔ اور ہمارے یہاں سکھایا نہیں جا رہا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

﴿وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین﴾

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۲؍مئی ۲۰۱۰ء بروز بدھ بوقت ۱۲:۳۰ بجے دوپہر﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العلمین، والصلوۃ والسلام علی سیدنا ومولانا محمد خاتم النبین وامام المرسلین وقائد الغر المحجلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وعلی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین۔ امابعد!

حضرات علماء کرام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

یہ میرے لئے باعث سعادت بھی ہے اور باعث مسرت بھی کہ ماشاء اللہ یہاں ''تدریب المعلمین'' کے ایک منہاج کا سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو نافع اور مفید بنائے۔ مجھ سے بھی فرمائش کی گئی کہ کچھ کلمات اس سلسلے میں آپ حضرات سے عرض کروں۔ میں خود تدریب کا محتاج ہوں تو کسی کی تدریب کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن اپنے بزرگوں سے جو کچھ باتیں سنی ہیں ان کی تکرار کرا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ بکثرت ہم لوگوں سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ جو طلبہ آپ کے پاس پڑھنے کے لئے آئے ہیں وہ اللہ جل جلالہٗ کی ایک بہت بڑی نعمت ہیں۔ کیوں کہ تعلیم بھی درحقیقت دعوت وتبلیغ کا ایک شعبہ ہے اور اصل دعوت وتبلیغ تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے گھر سے نکل کے کہیں جاتا ہے، کسی کو دعوت دیتا ہے۔ اس کو حق کا کوئی کلمہ پہنچاتا ہے۔ اس کے لئے بعض اوقات سفر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اپنی جگہ کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ محنت اور مشقت بھی اٹھانی پڑتی ہے، لیکن مدرسین کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کو جن کو دعوت دینی ہے یا تبلیغ کرنی ہے، ان کے گھروں تک پہنچادیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کو دعوت وتبلیغ کرنے کے لئے سفر کر کے کہیں اور جائیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے مستقر پر طلبہ کو جمع کردیا تو

سب سے پہلی بات جو ہر مدرس اور ہر معلم کو ذہن میں رکھنی چاہئے وہ یہ کہ یہ طلبہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہیں۔

اور پھر آدمی تبلیغ ودعوت کے لیے جائے تو کسی میں بات سننے کی طلب ہوگی کسی میں نہیں ہوگی۔ کوئی دھیان سے سنے گا کوئی نہیں سنے گا۔ کوئی مانے گا کوئی نہیں مانے گا۔ لیکن جو طلبہ آپ کے پاس پڑھنے آئے ہیں وہ تو درحقیقت اسی نیت سے آئے ہیں کہ آپ کی بات سنیں اور آپ کی بات مانیں تو اس میں غالب گمان یہ ہے کہ ان پر جو محنت کی جائے گی وہ انشاء اللہ ضرور بارآور ہوگی۔ اگر ہم کہیں کسی عام آدمی کو کوئی دعوت دینے جائیں، تبلیغ کرنے جائیں تو یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ ضرور قبول کریگا۔ رد بھی کرسکتا ہے۔ لیکن یہاں چونکہ طالبعلم آئے ہیں، طالبعلم کہتے ہی اس کو ہیں جو طلب علم رکھتا ہو۔ علم کی طلب لے کر آیا ہو تو اس بات کا اطمینان ہے کہ طلب ہے۔ اور چونکہ طالبعلم غالباً اسی لئے مدرس اور استاد کے پاس زانوئے تلمذ طے کرتا ہے کہ اس سے کچھ سیکھے تو غالب گمان یہ بھی ہے کہ جو کچھ اس کو بتایا جائے گا اس کو انشاء اللہ وہ قبول بھی کرے گا۔

لہذا یہ دوسری عظیم نعمت ہے ایک تو طالبعلم کا آجانا نعمت اور طالبعلم کے آجانے کے بعد اس بات کا اطمینان ہونا یہ نعمت ہے۔ تو سب سے پہلے تو ہر معلم، ہر مدرس، ہر استاد کو اللہ جل جلالہٗ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے یہ نعمت ہمارے پاس بھیج دی۔

دوسری بات یہ کہ یہ نعمت ایک امانت ہے استاذ کے پاس۔ اور اس امانت کا حق یہ ہے کہ جس کام کے لئے وہ آیا ہے۔ اور جس کام کے لئے آپ اس کو پڑھانے بیٹھے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا ﴾

اگر بالفرض اس امانت میں کوتاہی ہو تو اس کوتاہی کا مطلب یہ ہے کہ یہ خیانت ہے اس طالبعلم کے ساتھ بھی، اس کے والدین کے ساتھ بھی، اس کے سرپرستوں کے ساتھ بھی، مدرسہ کے ساتھ بھی اور مدرسہ کے معاونین کے ساتھ بھی جو چندہ دے کر یہ چاہتے ہیں کہ یہاں پر دین کی صحیح تعلیم ہو۔

ایک آدمی کی خیانت نہیں ہے۔ خود طالبعلم کی، اس کے والدین، سرپرستوں کی، اور مدرسہ والوں کی، اور مدرسہ کے معاونین کی۔ اگر اس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کی جائے تو ان سب کے ساتھ خیانت ہے۔ اس لئے سب سے اہم بات اپنی ذمہ داری کا احساس (یعنی) ان نعمتوں کی قدر ہے۔

اور اس ذمہ داری کا نہایت خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اگر ایک طالبعلم بھی ہمارے ذریعہ کوئی بات سیکھ گیا تو وہ ہمارے لئے مستقل ایک صدقہ جاریہ ہے۔

جب تک وہ اس بات پر خود عمل کرتا رہے گا اور دوسروں تک پہنچاتا رہے گا اور اس کی پہنچائی ہوئی باتوں پر دوسرے عمل کرتے رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کا اجر وثواب ہماری طرف منتقل ہوتا رہے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ثواب کمانے کا یہ اتنا عظیم راستہ رکھا ہے۔ اور اللہ بچائے اگر حق میں کوتاہی کی جائے، امانت میں خیانت کی جائے، تو عذاب کا بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔ کیوں کہ اس میں صرف حق اللہ ہی نہیں حقوق العباد بھی پامال ہو رہے ہیں، اس واسطے ذمہ داری ادا نہ ہونے پر گناہ کا بھی بڑا شدید اندیشہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں اس وبال سے محفوظ رکھے۔ اور امانت کو صحیح طریقہ سے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ایک بات تو سب سے پہلی (اور) مقدم یہ ہے کہ اس عظیم ذمہ داری کو آدمی سمجھے اور اگر اس ذمہ داری کو ادا کرے تو ﴿خیرُکم مَن تعلَّمَ القرآنَ وعلَّمہٗ﴾ کی حدیث کا مصداق بننے کا اللہ تعالیٰ نے ایک موقع عطا فرمایا ہے۔

تیسری بات یہ کہ تعلیم کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہے کہ جو سبق ہمارے سپرد ہے وہ سبق پڑھا دیا جائے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ جو ہمارے پاس پڑھ رہا ہے اس کو اس علم پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جائے جو اس کو دیا جا رہا ہے۔ اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ضروری ہیں۔ فرمایا:

العِلمُ بِلا عملٍ وَبالٌ والعملُ بغیرِ عِلمٍ ضلالٌ.

اگر علم نہ ہو اور عمل کرنا شروع کر دے تو کیا ہوگا؟ ضلال! یہ گمراہی ہے۔ اور اگر علم ہو اور العیاذ باللہ اس پر عمل نہ ہو تو یہ ایک مستقل وبال ہے۔ اللہ بچائے۔ میرے والد ماجد قدس اللہ تعالیٰ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر صرف کسی چیز کو جان لینا کسی چیز کا علم حاصل کر لینا موجب فضیلت ہوتا تو ابلیس سب سے زیادہ افضل ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اس کے پاس جتنا علم تھا وہ بہت سے بڑے بڑے محققین کے پاس نہیں ہوتا۔ امام رازیؒ کو بھی انتقال کے وقت ابلیس دلائل سے شکست دے گیا۔ آپ نے ان کا قصہ سنا ہوگا مشہور ہے۔ علم تو اس کے پاس بھی ہے۔ لیکن وہ علم کس کام کا جو انسان

کو اللہ تعالیٰ تک نہ پہنچا سکے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر آمادہ نہ کر سکے۔

ایسا علم آج بھی مغربی دنیا میں جا کے دیکھئے کہ مستشرقین کی ایک بہت بڑی جماعت ہے۔ جو ہماری ساری فقہ، حدیث، تفسیر کی کتابیں کھنگالے ہوئے ہے۔ ان کے مقالے دیکھو ان کی کتابیں دیکھو ہر کتاب اور مقالے میں ہماری اتنی کتابوں کے حوالے آپ کو نظر آئیں گے کہ بسا اوقات مسلمان علماء کی کتابوں میں اتنے حوالے نہیں ہوتے۔ ایسی ایسی کتابوں کے حوالے نظر آئیں گے کہ جن کا بعض اوقات نام بھی نہیں سنا ہوگا اتنی تحقیق!

تو بظاہر علم تو ہے لیکن وہ علم کس کام کا جو انسان کو ایمان بھی عطا نہ کر سکے۔ تو اس واسطے اَلْعِلْمُ بِلَا عَمَلٍ وَبَالٌ وہ تو وبال ہے العیاذ باللہ اور اَلْعَمَلُ بِغَیْرِ عِلْمٍ ضَلَالٌ۔ لہٰذا دونوں چیزوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے تب مقصد حاصل ہوگا۔ اس کے بغیر یہ مقصد پورا حاصل نہیں ہوتا تو

اہم بات یہ ہے کہ طالبعلم کو علم صحیح دو۔

ہمارے بزرگوں نے اس کے لئے فرمایا کہ ہر استاذ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ جانے سے پہلے اپنے سبق کی تیاری کرے۔ اس تیاری میں صرف اتنی بات نہیں ہے کہ جو کچھ پڑھانے جا رہا ہے اس کا مطالعہ کر لیا، یہ تو ہے ہی ضروری کہ مطالعہ کر کے اچھی طرح اس کو خود اپنے ذہن میں بٹھائے۔ اور جب تک کوئی مسئلہ واضح اور منشرح طور پر دل میں نہ آئے اس وقت تک نہ پڑھائے۔ ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا رسول خاں صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ کئی مرتبہ ہمارے یہاں دارالعلوم تشریف لائے انہوں نے ایک نصیحت یہ فرمائی تھی کہ دیکھو بھائی جو پڑھانے جا رہے ہو اس کے اوپر جب تک مکمل شرح صدر نہ ہو اس کو نہ پڑھاؤ۔ چھٹی لے لو اس دن، اس واسطے کہ بات واضح نہیں ہوئی۔ لیکن پڑھاؤ تو اس طرح پڑھاؤ کہ جب مکمل شرح صدر ہو چکا ہو کہ میں جو بات کہنے جا رہا ہوں واقعۃً وہی صحیح ہے وہی میں پڑھاؤں گا۔ اس کے علاوہ

مطالعہ اور تیاری میں یہ بھی دیکھنا ہے کہ طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو کس طرح میں آسان کر کے سمجھا سکتا ہوں۔ یعنی سمجھانے کا طریقہ بھی مطالعہ کے دوران سوچنا ہے۔

بعض اوقات کوئی بحث ہے، دقیق ہے، مشکل ہے طلبہ کی ذہنی سطح سے بالا معلوم ہو رہی ہے۔

یہ بھی مدرس اور استاذ کا فریضہ ہے کہ یہ سوچ کر جائے کہ کس طرح اس کو آسان کر کے طلبہ کو سمجھاؤں۔
میرے شیخ حضرت مولانا سبحان محمود صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہ، ہم نے ان سے ابتدائی کتابوں سے پڑھا تھا۔ میزان اور نحو میر سے لے کر چوتھے درجہ تک ساری کتابیں تقریباً ان سے پڑھیں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ

میں اپنے مطالعہ میں بہت کافی وقت اس پر صرف کرتا ہوں کہ جو مضمون پڑھانے جارہا ہوں اس کو کس طرح آسان کر کے سمجھاؤں، باقاعدہ اہتمام کرتا ہوں اس کو سوچنے کے لئے پورا وقت دیتا ہوں۔ بعض اوقات اس کا خاکہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کا خاکہ لکھ کر بورڈ پر سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ سوچ کر جاتا ہوں کہ بورڈ پر کس طرح سمجھاؤں۔

جب آدمی یہ سوچ کر جاتا ہے تو پھر دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل بحث طلبہ کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ تعالیٰ سرہ کان پور میں پڑھاتے تھے اور پتہ نہیں آپ نے نام سنا کہ نہیں سنا۔ پہلے زمانے میں فلسفے کی کتاب ہوتی تھی ''صدرا''، یہ مشہور کتاب تھی فلسفہ کی، دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں بھی داخل تھی۔ اب تو خیر نکل گئی، اچھا ہی ہوا کہ نکل گئی لیکن اُس زمانے میں وہ پڑھائی جاتی تھی۔ اس میں ایک بہت مشہور بحث مثنّاۃ بالتکریر کی آتی تھی۔ بڑی دقیق بڑی مشکل بحث تھی، طلبہ کو اس کا بڑا ہوّا ہوتا تھا کہ جب یہ بحث آئے گی تو پتہ نہیں کیا ہوگا؟۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن سبق میں جا کے اِس سبق کے آنے سے پہلے یہ نام لئے بغیر کہ مثنّاۃ بالتکریر کی بحث پڑھا رہا ہوں ویسے ہی ایک عام طریقہ سے آسان انداز میں اس کا خلاصہ طلبہ کو بتادیا جب طلبہ کو بتادیا تو ان سے پوچھا کہ سمجھ گئے؟ سب نے کہا سمجھ گئے۔ سب سے پوچھا تو معلوم ہوگیا کہ سمجھ گئے۔ جب سب نے کہا کہ ہم سمجھ گئے تو کہا یہ جو بحث میں نے آپ کے سامنے بتائی ہے یہ مثنّاۃ بالتکریر کی بحث ہے۔

اب طلبہ بڑے حیران ہوئے کہ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ یہ تو کوئی بہت بڑی گھاٹی ہے مشکل گھاٹی جس کو عبور کرنا بڑا مشکل ہے یہ تو پانی ہوگئی۔ تو

استاذ کا کام یہ ہے کہ علم ایک تو صحیح دے اور ایسے طریقے سے دے جو دل میں اتر جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُولِهِمْ﴾
یعنی جس ذہنی سطح کا آدمی ہے اسی کے حساب سے اس سے بات کرو یہ نہ ہو آپ نے اپنی طرف سے تو تقریر جھاڑ دی اور طالبعلم کے پلے کچھ نہ پڑا تو درس کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ لہذا تیاری کے دوران یہ ضروری ہے کہ سمجھانے کا طریقہ بھی طے کیا جائے۔

اور پھر علم کا جو دوسرا شعبہ ہے یعنی عمل، اس کی عملی تربیت طلبہ کو دینے کا اہتمام ہو، طلبہ کی زندگیوں میں مدرس داخل ہو، ان کے دکھ درد میں شریک ہو۔ یہ دیکھے کہ آیا اس علم کے اثرات ان کی زندگی کے اندر آ رہے ہیں یا نہیں آ رہے ہیں۔

ہمارے اکابر علماء دیوبند جن کے ہم سب نام لیوا ہیں۔ اس بارے میں ان کا طریقہ کیا تھا؟ دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تاریخ اس جملہ سے نکلتی ہے

﴿در مدرسہ خانقاہ دیدیم﴾

کہ ہم نے مدرسہ میں خانقاہ دیکھی، اور یہ حقیقت تھی کہ جو لوگ پڑھ رہے ہوتے تھے وہ پڑھ بھی رہے ہیں اور ساتھ ساتھ دین کی، اتباع سنت کی، ذکر و اذکار کی، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی، تعلق مع اللہ کی تربیت بھی لے رہے ہیں۔

چنانچہ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دن کے وقت وہ جگہ قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے گونجتی تھی اور رات کے وقت وہاں سے اللہ کے ذکر کی اور لوگوں کے رونے کی اور اللہ کے سامنے گڑگڑانے کی آوازیں آتی تھیں۔

وہ جو صحابہ کرامؓ کے حالات میں آتا ہے کہ: ﴿رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ﴾ رات کے وقت راہب ہوتے، اور دن کے وقت بہترین شہسوار ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی جھلک ہمارے حضرات اکابر کی زندگیوں میں دکھائی تھی۔ ان میں سے ایک ایک رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ کا نمونہ تھا۔ میرے دادا حضرت مولانا محمد یاسین صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ زمانہ پایا ہے کہ جب وہاں شیخ الحدیث سے لے کر چوکیدار تک ہر شخص صاحب نسبت ولی اللہ تھا۔ چوکیدار، چوکیداری کر رہا ہے اور ذکر میں مشغول ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ

نے یہ دولت عطا فرمائی تھی۔ ورنہ تحقیقی ادارے دنیا میں بہت ہیں۔ اب بھی ہیں اور پہلے بھی رہے ہیں لیکن

دارالعلوم دیوبند کو اور دارالعلوم دیوبند کا جو ہم پلّہ "مظاہر علوم" تھا ان مدارس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو امتیاز بخشا وہ درحقیقت اس وجہ سے تھا کہ عمل کی تربیت تھی اور تربیت اسی وقت ہوسکتی ہے کہ جب اساتذہ خود عمل پیرا ہوں۔

اس کے لئے دارالعلوم دیوبند کے اکابر میں یہ بات آپ دیکھیں گے کہ حضرت نانوتویؒ حضرت گنگوہیؒ سے لے کر حضرت مدنیؒ حضرت عثمانیؒ حضرت والد ماجدؒ، حضرت بنوریؒ تک جتنے ہمارے اکابر ہیں جنہوں نے کوئی کام کیا جن کا فیض پھیلا ان سب کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد کسی نہ کسی اللہ والے سے بیعت کر لیتے تھے۔ ان کی صحبت اٹھاتے تھے ان سے اصلاحی تعلق قائم کرتے تھے۔ ان کے آگے جا کر اپنے آپ کو پامال کرتے تھے ان کی نقل وحرکت کو، ان کی ادا، ادا کو دیکھتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی دولت، رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ عطا فرماتے تھے۔ تو ہر شخص بذاتِ خود (یعنی) استاذ کی جو ذات ہے وہ معلم ہوا کرتی تھی۔

ایک واقعہ سنا کر بات ختم کرتا ہوں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے ان کو اطلاع ملی کہ اساتذہ دیر سے آتے ہیں۔ یعنی ذرا دیر کر دیتے ہیں تو حضرت نے اور کچھ نہیں کیا بس اپنی چارپائی اٹھا کے دارالعلوم دیوبند کے گیٹ پر ڈال دی۔ اور صبح کو بیٹھ کر وہاں تسبیح پڑھتے رہتے تھے۔ اب جو کوئی مدرس دیر سے آ رہا ہے (انھیں دیکھ کر فرماتے) السلام علیکم! بس اور کچھ نہیں صرف سلام کر لیتے تھے۔ تو نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اساتذہ چوکس ہو گئے اور صحیح وقت پر آنے لگے۔ سارے استاد تو صحیح وقت پر آنے لگے مگر حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ جو صدر مدرس تھے، بڑے جامع الکمالات اور جامع العلوم آدمی تھے، دنیا کا کوئی علم وفن انہوں نے نہیں چھوڑا تھا۔ اللہ نے ہر علم وفن میں ماہر بنایا تھا ان کے ساتھ لوگ لگے رہتے تھے۔ کوئی تعویذ مانگ رہا ہے، کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے، کوئی دعا کرا رہا ہے، تو آتے آتے ان کو دیر ہو جاتی۔ اور اساتذہ تو وقت پر آنے لگے وہ رہ گئے۔ وہ پھر بھی دیر سے آتے تھے۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو خط لکھا۔ حضرت گنگوہ میں تھے، دارالعلوم کے سرپرست تھے ان کو خط لکھا کہ حضرت! اساتذہ دیر سے آتے تھے اب اس طرح میں بیٹھتا ہوں تو اس کے نتیجہ میں الحمد للہ لوگ صحیح وقت پر آنے لگے ہیں۔ البتہ مولانا یعقوب صاحب اب بھی بہت دیر کرتے ہیں۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے پہلے تو خط لکھا حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کو اور خط میں لکھا کہ مولوی صاحب! آپ یہ سمجھتے ہو گے کہ ہم خدمتِ خلق میں مشغول ہیں اور بڑی خدمتِ خلق کر رہے ہیں۔ یاد رکھو آپ خدمتِ خلق میں لگ کر ان طلبہ کا نقصان کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہو جائے گی کہ طالبعلموں کا نقصان کر رہے ہو۔

پھر ایک مرتبہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دیو بند آئے تو مولانا رفیع الدین صاحب کو یعنی مہتمم صاحب کو بلایا اور بلا کر کہا کہ میں نے ان کو کہہ تو دیا ہے۔ لیکن اب بھی وہ آئیں گے نہیں۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ مسائل بہت سارے ہیں۔ ان کا فیض جاری ہے پتا نہیں کہاں کہاں جاری ہے۔ لہذا صحیح وقت پر آنا ان کے لئے مشکل ہے، کوشش کریں گے لیکن ایک بات بتا دیتا ہوں کہ اب تم ان کو بھول جاؤ، اس لئے کہ یہ وہ شخص ہے کہ اگر سارے دن میں مدرسہ کا صرف ایک چکر لگا لے تب بھی اس کی تنخواہ مہنگی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہ پڑھائے صرف مدرسہ کا ایک چکر لگا لیا کرے۔ تو بھی یہ مہنگا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر اتنا اثر رکھا ہے۔ اتنی عظیم ان کی روحانیت ہے۔ تو اس روحانیت کی وجہ سے پھر بھی طلبہ کو فائدہ ہوگا۔ تو بھائی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو یہ توفیق عطا فرمائے۔ اور راستہ اس کا ہے رجوع الی اللہ، ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو۔

میرے شیخؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم سبق پڑھانے جاؤ تو راستے میں دعا مانگتے ہوئے جاؤ کہ یا اللہ! پڑھانے جا رہا ہوں شرح صدر کے ساتھ پڑھانے کی توفیق عطا فرمایئے۔ اور طلبہ کو اس سے فائدہ پہنچا دیجئے۔ اور اس کو میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنا دیجئے۔ جتنا جتنا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگا اتنا ہی اس کے ساتھ تعلق مضبوط ہوگا، اتنا ہی طلبہ کو فائدہ ہوگا۔

بس بھائی یہ چند باتیں تھیں جو بزرگوں سے سنی ہوئی ہیں اور آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنی تھیں۔ جہاں تک اس تدریب المعلمین کے علمی وفنی مسائل ہیں تو میں خود اس تدریب کا محتاج ہوں۔ اس واسطے میرے لئے کچھ عرض کرنا مشکل ہے اور وقت بھی نہیں لیکن یہ چند بنیادی باتیں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ ہمارے ذہنوں میں بٹھادیں اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمادیں تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ یہ ہماری تدریس نافع بھی ہوگی اور ہمارے لئے بہت اعلیٰ درجہ کی ذخیرۂ آخرت بھی ہوگی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

﴿وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین﴾

حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۲؍مئی ۲۰۱۰ء بروز بدھ﴾

نحمده ونصلی علی رسوله الكريم

اما بعد! أعوذ بالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم

(قل اطيعوا الله واطيعو الرسول)

میرے بزرگو! میں تو اس لائق نہیں کہ آپ سے خطاب کرتا یہ حضرات لے آئے ہیں تو کچھ کہنا ہے تو قرآن مجید میں جو فرمایا گیا ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جو جاہلیت کا زمانہ تھا اس میں ظاہر بات ہے کہ ساری ایسی قوم میں حضور کو بھیجا گیا جو تمدن سے یعنی جو مروجہ معنی ہے اس اعتبار سے تمدن سے وہ قوم بہت دور تھی۔ اس میں پڑھے لکھے لوگوں کا شمار تو انگلیوں پر ہوتا تھا۔ ایسی قوم میں بھیجا گیا جنہیں تمدن سے کم ہی واسطہ تھا۔ تمدن کا مطلب یہ ہے جن میں لکھنے پڑھنے کا کوئی رواج ہو، تو ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج برائے نام تھا ایسا کہ انگلیوں میں گنا جائے ان کے یہاں معراج تمدن کی یہ تھی کہ آدمی کو تین باتیں آتی ہوں۔

۱۔ تیراندازی آتی ہو۔

۲۔ تیراکی آتی ہو۔

۳۔ لکھنا پڑھنا آتا ہو۔ وہ پڑھا لکھا متمدن کہلاتا تھا۔ اس کو مردِ کامل کہا جاتا تھا۔ آدمی ایسا ہو جو لکھ پڑھ سکتا ہو وہ مردِ کامل ہے۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں گویا وہ مردِ مہذب بھی ہے اور عرفِ عام میں گویا مردِ کامل بھی ہے۔ جو خوبیاں کمالات کی ہوتی ہیں وہ اس میں جمع ہیں۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک ایسی قوم میں حضور ﷺ کو مبعوث کیا جس کی معراج کمال یہی ہے کہ اس کو اتنا آتا ہو۔

جب حضور ﷺ کو بھیجا گیا رسالت سے سرفراز کیا گیا تو آپ نے خفیہ طور پر دعوت کا آغاز کیا اور پڑھنے لکھنے کا سوچنے سمجھنے کا اس قوم کو عادی بنایا چنانچہ حضور ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تو وہ بھی ایسی خفیہ کہ رازداری کے ساتھ یہ کام چلتا رہا اور جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام نہ لائے اس وقت تک یہ قصہ ایسا ہی چلتا رہا۔

مکی زندگی میں فقہی بصیرت کا آغاز:

ابھی حضور ﷺ کی بعثت کے چھ سال گزر چکے تھے، آپ دیکھئے کہ اس خفیہ دعوت وتبلیغ کا ایسا اثر تھا کہ پورا معاشرہ بلبلا اٹھا تھا۔ جو وہاں جاتا ان کا اسیر ہو جاتا، اور ایسا گرویدہ ہوتا کہ سب کچھ چھوڑ کر انہیں کی بات مانتا انہیں کے کہے پر چلتا، یہ ۶۱۷ء کی بات ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (جو اس وقت اسلام نہیں لائے تھے) نے جب یہ ساری صورتحال دیکھی تو ان سے برداشت نہ ہوا، چنانچہ ایک روز تلوار لے کر نکل کھڑے ہوئے کہ آج اس کا کام تمام کرنا ہے۔ راستے میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا کیا حال ہے؟ کہاں چلے؟ کہا کہ بس آج تو اس کا کام تمام ہی کرنا ہے، ان صاحب نے کہا کہ بھائی وہاں بعد میں جاؤ پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ آپ کی بہن اور بہنوئی خود ہی اس دعوت کے شکار ہو گئے ہیں۔ یہ سن کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بجائے ادھر جانے کے بہن کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے، یہاں پہنچ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آواز سنی۔ پتہ چلا کہ کوئی صاحب بہن اور بہنوئی کو پڑھا رہے ہیں۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ بہن، بہنوئی نے حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کو جو قرآن پڑھا رہے تھے یعنی معلم کے فرائض انجام دے رہے تھے، مکان کے کسی کونے میں چھپا دیا اور دروازہ کھولا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر داخل ہوتے ہی کہا کہ جلدی بتاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ لاؤ دکھاؤ کیا ہے تمہارے پاس؟ وہ بے چارے انہیں سمجھانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپے سے باہر ہو گئے اور بہن اور بہنوئی دونوں کو خوب مارا پیٹا، آخر کار بہن نے کہا کہ بھائی ہمیں دکھانے میں کوئی تامل نہیں ہے لیکن اس کے چھونے کے لئے شرط یہ ہے کہ آپ ظاہری طہارت کر لیں **لا یمسہ الا الطاہر** اسے پاک صاف ہو کر ہی چھونا چاہئے چنانچہ وہ پاک صاف ہو گئے، اب بہن نے وہ آیت انہیں دکھادی جو وہ پڑھ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ آیت پڑھی، اور پڑھتے ہی ان کی کایا پلٹ گئی، اندازہ فرمایئے کہ تعلیم وتربیت کا اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ خواتین تک کتاب کا ادب واحترام جانتی تھیں اور فقہی بصیرت ومسائل سے واقف تھیں کہ کس طرح سے اس کو پڑھنا ہے، اور کیسے اس کی حفاظت کرنی ہے؟

اس واقعہ سے یہ عقدہ کھلا اور یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ بعثت نبوی کے ابتدائی زمانہ میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ ایسے مؤثر انداز میں جاری تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جبکہ ابھی صرف ۱۲ خواتین اور

۴۰ مرد اسلام لائے تھے، پڑھنے لکھنے سے ناآشنا ونابلد اور سامان کتابت سے ناواقف قوم کو ادب واحترام اور پاکیزہ اخلاق کے اعلیٰ معیار کا مالک بنادیا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی دور کے مسلم معاشرہ کا ہر فرد بلند اخلاق سے آراستہ تھا، اور جو ایسا ہو وہ کسی بھی طرح کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا، اور معلوم ہوا انفرادی واجتماعی دونوں طرح کی تعلیمات ہر مسلمان کا فریضہ ہیں، اسی سے اسلام کی روشن تعلیمات کی حقانیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی آیت پڑھ کر متاثر ہوئے تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو بلا لیا گیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ابشر، تمہیں بشارت ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے اسلام کے لئے دعا کی تھی ان میں سے ایک تم ہو۔ ابھی اور آگے چلیں، ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت نہیں کی تھی کہ مدینہ سے ایک وفد آیا اور اسلام قبول کیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی کہ ہماری رہنمائی وتعلیم کے لئے کسی کو بھیجئے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم بنا کر مدینہ بھیجا، اور فرمایا

"لیقرأھم القرآن ولیفقھھم"

"اصل مقصود حدیث سے فقہی بصیرت پیدا کرنا ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تین قسمیں ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال۔

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریرات۔

کسی صحابی نے کوئی عمل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی، یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی عمل کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی اور اسے درست قرار دیا تو اسے تقریر کہتے ہیں۔

احادیث کا ایک حصہ وہ ہے جس میں آپ کے جسمانی اوصاف یعنی حلیہ مبارکہ، قد وقامت، گفتار ورفتار، عادات واطوار، اور میل جول وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ان احادیث کو شمائل کہا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ابدی ہے اور ان کی رسالت قیامت تک کے لئے ہے اسی لئے انبیاء میں کوئی نبی ایسا نہیں جس کی تعلیمات روز اول سے ایسی محفوظ ہوں جیسی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات محفوظ ہیں

یہ اس امت کا کمال ہے کہ اس نے اپنے نبی کی ساری چیزیں محفوظ کیں۔ یہی دین اور یہی شریعت ہے۔امت محمدیہ میں دین کی حفاظت کرنیوالے دوقسم کے ہوئے۔

(۱) ایک فریق وہ ہے جس نے حضور ﷺ کے مبارک ارشادات کو جوں کا توں محفوظ رکھنے کی خدمت سرانجام دی اور عربوں کا حافظہ ضرب المثل ہے، وہ لکھتے کم تھے، وہ اپنا ثقافتی سرمایہ اشعار کی صورت میں اپنے دل ودماغ میں نقش کر لیتے تھے، کسی کے ہاں کوئی شاعر پیدا ہوتا تو بڑی بڑی ضیافتیں اور دعوتیں کی جاتی تھیں، حتی کہ عہد عباسی تک عرب اپنا ثقافتی سرمایہ سینوں میں محفوظ رکھتے آرہے تھے۔

ابوعمرو اسحٰق بن مرار مشہور امام اللغۃ، محدث اور امام احمد بن حنبل کے استاد ہیں، ان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اسّی (۸۰) سے زیادہ قبائل کے دواوین انہیں حفظ تھے، موصوف نے ان دواوین کو مرتب کیا، جب ایک دیوان مرتب کرتے تو قرآن کریم کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر کوفہ کی مسجد میں وقف کردیتے تھے، اس طرح کرتے کرتے قرآن کریم کے اسّی (۸۰) سے زیادہ نسخے وقف کردیئے، موصوف نے ۱۱۲ سال عمر پائی اور جب تک دم میں دم رہا اپنے ہاتھ سے لکھتے رہے۔اس سے معلوم ہوا کہ عرب کس بلا کے حافظہ کے مالک تھے، اور معلوم ہوا کہ صحابہ احادیث کے علوم صدور میں محفوظ کرتے تھے حتی کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے ارشادات کو لکھنا شروع کردیا تو اس پر بعض صحابہ نے اعتراض کیا کہ حضور ﷺ تو بشر ہیں خوشی ناخوشی مختلف کیفیات میں ہوتے ہیں ہر بات لکھنے سے خلط ملط کا اندیشہ ہے۔اس پر عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سامنے یہ بات رکھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ

"لایخرج منه الاحقا"

فرمایا کہ لکھا کرو، میری زبان سے حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلتی، تو اس طرح سے لکھنے والے بھی پیدا ہوگئے اور حضور ﷺ نے لکھنے کا بھی اہتمام فرمایا، چنانچہ غزوۂ بدر میں لکھنا پڑھنا جاننے والے قیدیوں کی رہائی کا فدیہ یہ مقرر ہوا کہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، پھر آزادی ملے گی۔جس دنیا میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون ہو وہاں ارباب فن وکمال کو اتنی آسانی سے رہائی نہیں ملتی، چنانچہ جب جرمن کی حکومت جاتی رہی تو وہ وہاں کے سارے جرمنی دانشوروں کو پکڑ کر لے گئے اپنے وطن میں رہنے نہ دیا، اور سال بھر کے بعد ایک دیوار برلن بنادی کہ اس پر آکر درشن کروادیا کرو۔لیکن

ادھر حضور ﷺ کے کریمانہ اخلاق ملاحظہ فرمائیں کہ صرف دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر ارباب فن وکمال کو بھی رہائی مل رہی ہے، سبحان اللہ، حضور ﷺ نے اقرأ اور علّم بالقلم دونوں چیزوں پر کام کیا اور کروایا۔ حتی کہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے موقع پر آپ ﷺ کے پاس قلم ودوات موجود تھے، چنانچہ دوران ہجرت آپ ﷺ نے سراقہ کو امان نامہ لکھ کر دے دیا تھا۔ جیسے جیسے قرآن کریم کا نزول ہوتا، حضور ﷺ اسے لکھواتے یوں کتابت کا سلسلہ پروان چڑھتا رہا۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح آپ ﷺ نے اپنے قول وفعل سے تعلیم کو عام کیا آپ کے شیدائیوں نے بھی آپ کے اقوال وافعال اور کیفیات کو اقرأ اور علم بالقلم کے ذریعہ محفوظ کیا، تو ایک فریق تو وہ ہے جو حضور ﷺ کے اقوال وافعال کو جوں کا توں محفوظ رکھتا ہے یہ فریق محدثین کی جماعت ہے۔ حضور ﷺ نے ان کو ہدایت کی تھی کہ تم نے جو چیز محفوظ کی ہے وہ دوسروں تک پہنچادو۔ ممکن ہے جن کو تم پہنچارہے ہو وہ تم سے زیادہ سمجھدار ہوں، اور سب سے زیادہ اس کی تہ تک پہنچنے اور حکم مستنبط کرنے والے ہوں، تو حضور ﷺ نے سارے عالم کو یہ ہدایت کی یہ علم کسی کی میراث نہیں ہے، اسے آگے پہنچاؤ، الحکمة ضالة المؤمن حیث وجدها فهو احق بها اور مسلمانوں نے یہی کیا کہ جن کے کتب خانوں سے انہوں استفادہ کیا ان میں علمی اضافہ کرکے ان کے فیض کو عام کردیا اور ہر پڑھے لکھے کو ان سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا۔

اسلام میں کتابوں پر کوئی ٹیکس نہیں ہے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بعض حضرات مسجد میں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے، حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ بھائی مسجدوں میں درس دینے والوں کے نام اور کیفیات میرے پاس بھیجدو، گورنروں نے درس دینے والوں کی کیفیات لکھ کر عمر بن عبد العزیز کو بھیج دیں، چنانچہ انہوں نے ان سب کا وظیفہ جاری کردیا، اس میں بعض حضرات نے لیا اور بعض نے انکار کردیا۔ جنہوں نے انکار کیا ان کے بارے میں عمر بن عبد العزیز نے لکھا۔

"کثر الله امثالك" اللہ تم جیسے بہت پیدا کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام کی تعلیمات کی حفاظت کس طرح سے ہوئی ہے، ان ہی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے اقوال واحوال کو کتابوں میں درج کرلیا گیا۔ اب کسی نے

حدیثیں زبانی یاد کیں تو حافظ حدیث کہلایا، اور کسی نے ویسے ہی سمجھ کر کوئی حکم مستنبط کیا تو وہ فقیہ کہلایا، کہیں ایسا بھی ہوا کہ دونوں جمع ہوگئے تو حافظ حدیث بھی ہوئے اور فقیہ بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو انہیں زبردستی سوار کیا اور خود پیادہ پا ساتھ چلے، پھر جو سوالات کئے ان میں جو سب سے اہم ہے یہ تھا کہ بھئی تمہیں جہاں بھیجا جارہا ہے وہاں تم معاشرہ کے مسائل کیسے حل کروگے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تلاش کرونگا، آپ نے فرمایا اگر اس میں نہ ملے تو؟ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سنت رسول میں دیکھونگا، فرمایا اس میں بھی نہ ملے تو؟ اس سوال سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دیکھو نصوص وسنن محدود ہیں اور نوازل واقعات غیر محدود ہیں، انہیں کیسے حل کروگے؟ فرمایا پھر میں اجتہاد کرونگا، دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہت پسند کیا اور آپ کی بڑی تعریف کی، اور دعا بھی دی، اور فرمایا کہ ممکن ہے آئندہ تم مجھے نہ پاؤ، گویا آپ نے خود اپنی امت کو یہ فرمادیا کہ پیش آمدہ مسائل کا حل تمہارے ذمہ ہے، چنانچہ جس جماعت کا کام مسائل حل کرنا تھا وہ مسائل حل کرتے رہے، اور جس جماعت کا کام حدیثیں یاد کرکے آگے پہنچانا تھا، وہ حدیثیں لکھواتے رہے اور آگے پہنچاتے رہے، اور املا کا ایسا چرچا ہوا کہ محدثین نے حدیث کے جملہ علوم میں اس کا اہتمام کیا، محدثین جب پوری کتاب املا کرادیتے تو استاد آخر میں تمام شاگردوں کے نام مع اجازت کے کتاب پر لکھ لیتے تھے۔

چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جس کا نام کتاب کے آخر میں درج تھا اپنے شریک درس سے (جس کے پاس کتاب کا نسخہ موجود تھا) کہا آپ اپنی کتاب مجھے عاریتاً دیدیں میں نقل کرکے آپ کو دیدونگا، اس نے دینے سے انکار کردیا، اس ساتھی نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کردیا کہ میں اس شخص کے ساتھ درس میں شریک تھا اور اب یہ اپنا نسخہ نقل کے لئے مجھے دینے سے انکار کرتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب نے موصوف کے حق میں فیصلہ کردیا اس طرح سے اسلامی قلمرو میں سارے نسخے پھیلتے رہے۔

عہدِ رسالت میں مفتی کے فتوے پر صحابہ کا عمل:

گوناگوں مشغولیوں کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت دربار رسالت میں موجود نہیں رہتے تھے، اس

لئے حضور ﷺ کی غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ یا حادثہ پیش آتا اور حضور ﷺ کے مامور کردہ مفتیان کرام موجود ہوتے تو مسئلہ بتادیتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کسی جگہ جنگل سے شیر آنکلا اس کو پکڑنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ گڑھا کھودا گیا اس پر بلیاں اور چٹائیاں ڈالکر اوپر سے مٹی ڈالی گئی، چنانچہ شیر اس گڑھے میں جاگرا، اور ادھر شور ہوا کہ شیر آ گیا شیر آ گیا، سب شیر کو دیکھنے دوڑے، اب گڑھے کے اردگرد کچھ نہ ہونے کی وجہ سے دیکھنے والوں میں ایک کا پاؤں پھسلا، اس نے برابر والے کو پکڑا، اس نے تیسرے کو پکڑا تیسرے نے چوتھے کو پکڑا، اب چاروں کے چاروں گڑھے میں گرے، اور شیر نے چاروں کو شکار کیا۔ اب دیت کا مسئلہ پیدا ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے مسئلہ کا جواب ارشاد فرمایا، پھر یہ فتویٰ حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے اس کی تصویب فرمائی، یہ چیزیں تقریر کہلاتی ہیں، اور فتوے پر عمل کرنا تقلید ہے۔

اور محدثین جو حدیثیں یاد کرتے تھے کبھی کبھار چپ چاپ ان کا امتحان بھی لیا جاتا تھا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ عبد الملک نے کہا کہ بچوں نے آپ سے حدیثیں سننے کی فرمائش کی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک تختہ پر بٹھایا جس پر پردہ تھا اور تختہ کے نیچے خفیہ طور پر ایک کاتب بٹھایا، اب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حدیثیں بیان کرتے رہے، اور وہ کاتب لکھتا رہا، یہاں تک کہ اس طرح عبد الملک نے بچوں کو پڑھانے کے بہانے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیثیں لکھوالیں پھر سال بھر کے بعد عبد الملک نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ بلایا اور کہا کہ بچوں کو وہ حدیثیں اب یاد نہ رہی، لہذا آپ دوبارہ بیان کردیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پھر حدیثیں بیان کردیں، اور حسب السابق تختہ کے نیچے کاتب لکھتا رہا یہاں تک ۴۰۰ حدیثوں میں بال برابر بھی فرق نہیں آیا، اندازہ کیجئے صحابہ وتابعین نے احادیث کی حفاظت میں کس درجہ محنت اور احتیاط کی ہے۔

محدث کا وظیفہ صرف حدیثیں بیان کرنا ہے۔

مسائل کا استنباط مجتہد کا وظیفہ ہے۔

نصوص شرعیہ سے مسائل کا استنباط کرنا فقیہ ومجتہد کا کام ہے چونکہ فقیہ مجتہد خوف آخرت کے پیش نظر استخراج مسائل سے احتراز کرتا ہے اس لئے شریعت مطہرہ نے اجتہاد میں بایں معنی وسعت رکھی کہ جو شخص صدق نیت سے محض شرعی مسئلہ واضح کرنے کے لئے اجتہاد کرے تو اس پر اجر کا وعدہ کیا، اجتہاد

درست ثابت ہونے پر دو اور غلط نکلنے پر ایک اجر کا وعدہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا مجتہد مخطی ہونے کی صورت میں بھی اس سے باز پرس نہیں ہوگی، ہاں اگر اجتہاد کی بنیاد محض ہوا و ہوس پر ہو تو اس پر کسی بھی اجر کا وعدہ نہیں ہے اور اس کی سزا جہنم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجتہدین استنباط مسائل میں کس درجہ احتیاط کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قضا کا عہدہ سرکار کی طرف سے ملتا تو محتاط لوگ اسے قبول نہیں کرتے تھے، چنانچہ ہمارے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ویسے تو سارا مذہب مدون کیا لیکن سرکار کی طرف سے پیش کردہ قضا کا عہدہ قبول کرنے پر موت کو ترجیح دی۔

پھر فقہا میں دو گروہ ہو گئے۔

۱۔ ایک طبقہ وہ تھا جو مسئلہ پیش آنے کی صورت میں حکم بتا دیتے تھے۔

۲۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو مسئلہ پیش آنے سے پہلے ہی اس کی پلاننگ کرتے تھے، چنانچہ ہمارے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ انہی فرضی مسائل کو بھی زیر بحث لاتے تھے اور یہ بات کوئی خلاف شریعت نہیں ہے، عہد رسالت میں بھی صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرضی مسائل پوچھے ہیں، چنانچہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں اپنے بستر پر کسی غیر مرد کو دیکھوں تو کیا کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار گواہ لاؤ۔ ملاحظہ فرمائیں آپ نے کہ ابھی مسئلہ واقع نہیں ہوا اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اس کا حکم پوچھ رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم ارشاد فرما رہے ہیں۔

اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ان فرضی مسائل کا زیادہ تر جواب نہیں دیتے تھے، چنانچہ اسد بن فرات امام مالک کے پاس آئے تو امام مالک بڑی توجہ سے ان کو پڑھاتے رہے، پھر جب اسد بن فرات نے فرضی سوالات شروع کر دیئے تو امام موصوف نے دو تین کے تو جوابات دیئے، مزید فرضی سوالات کرنے پر امام مالک نے اسد بن فرات سے کہا کہ میاں عراق کا راستہ لو تمہارا مطلب وہیں حاصل ہو سکتا ہے ہم واقع شدہ مسائل کا جواب دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسائل کا استنباط فقیہ و مجتہد کا وظیفہ ہے محدث کا نہیں۔ کتب حدیث پڑھانے کے تین طریقے ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث پڑھانے کے تین طریقے ذکر کیے ہیں:

۱۔ سرد کا طریقہ: سرد یہ ہے کہ صرف الفاظ کو پڑھا جائے۔

۲۔ بحث کا طریقہ: عبارت پڑھتے پڑھتے صرف مغلق مقامات کی وضاحت کرنا۔

۳۔ امعان کا طریقہ: غور وفکر کے ساتھ تہہ تک پہنچنا، اور ہر چیز کو تفصیل کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرنا، یہ تینوں طریقے شاہ صاحب کے ذریعے عام ہوئے، اور ہمارے ہاں بھی یہی رائج ہیں، ترمذی شریف کے علاوہ اکثر کتابوں میں سرد ہوتا ہے، مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب نے فرمایا کہ مفتی شرف الدین رامپوری ایک دفعہ ٹونک تشریف لائے تو مفتی محمود حسن صاحب ''معجم المؤلفین'' کے والد صاحب نے مفتی شرف الدین رامپوری صاحب سے کہا کہ میرے لڑکے کو تحریر ابن ہمام پڑھادیں، انہوں نے فرمایا کہ میاں پڑھادیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ عبارت میں کوئی غلطی نہ آئے، اس میں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

چنانچہ انہوں نے عبارت پڑھی اور عبارت میں کہیں بھی غلطی نہیں کی۔ یہ مثال ہے سرد کی، اور اگر عبارت میں استاد بحث کرلے تو یہ مثال ہے بحث کی، اور اگر مکمل تفصیل کے ساتھ پڑھائے تو یہ امعان کی مثال ہوگی، مفتی محمود حسن صاحب کے فہم وفراست کا یہ عالم تھا کہ نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ محسن یمانی جو ایک واسطہ سے علامہ شوکانی کا شاگرد اور فتح الباری کا حافظ تھا، کو ھندوستان لے آئے، ادھر مفتی محمود حسن صاحب بھی سند حدیث کے لئے شیخ حسین العرب کے پاس آئے انہوں نے ان سے سنن نسائی پڑھوائی، یہ نسائی پڑھتے رہے، ایک جگہ شیخ حسین العرب نے ان سے ایک حدیث کی توجیہ پوچھی، انہوں نے توجیہ بیان کی توجیہ سن کر شیخ حسین العرب فوراً اٹھ کر چلے گئے (اور کہا کہ ان سے کہہ دو بیٹھے رہے جائے نہیں) اور فتح الباری میں مفتی محمود حسن کی بیان کردہ توجیہ دھونڈنے لگے، آخرکار یہ توجیہ شیخ حسین العرب کو نہ ملی تو انہوں نے مفتی محمود حسن صاحب سے کہا کہ تمہیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور سند عنایت کردی، یہ سرد، بحث اور امعان تینوں کی مثال ہے سرد اس طور پر ہے کہ طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے، بحث یوں ہے کہ استاد نے شاگرد سے پوچھ لیا اور امعان اس لئے ہے کہ شاگرد نے توجیہ بیان کی اور وہ بالکل درست تھی شاگرد امعان کے ساتھ پڑھتا

رہا استاد عمق وامعان کے ساتھ سنتا رہا بحث وتحقیق کی ضرورت نہ رہی یوں استاد نے شاگرد کو سند عنایت کردی۔

اس دور میں اسی طرح جانچ پڑتال کے بعد سند دی جاتی تھی۔

استاد شاگرد کا تعلق:

اب کچھ باتیں ان لوگوں سے عرض کرنی ہیں جو یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں ان سے عرض یہ ہے کہ بھئی شاگرد استاد سے بہت کچھ سیکھتا ہے، مسائل کا حل، نفس موضوع پر گرفت، اخلاق وعادات، یہ ساری چیزیں شاگرد اپنے استاد سے سیکھتا ہے تو استادوں کو چاہئے کہ ان تمام چیزوں کا خیال رکھیں۔ میں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو پانچ برس دیکھا اور ایک سال ان سے پڑھا ہے، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے سر میں درد ہوا ہو، انہیں کھانسی آئی ہو یا ان کے لب ولہجہ میں فرق آیا ہو۔ جس نشست پر بیٹھتے تو آخر تک اس پر بیٹھے رہتے، تین تین گھنٹے گزر جاتے اور ان کی آواز میں ذرا فرق نہ آتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ صحابہ کا نام آیا ہو اور انہوں نے رضی اللہ عنہ نہ کہا ہو، اور کسی امام کا نام آئے اور انہوں نے رحمۃ اللہ علیہ نہ کہا ہو، جب اللہ پڑھانے کا موقع دیں تو، ایک تو یہ جانیں کہ یہ اللہ کی نعمت ہے اور پھر اس کے ذریعہ اپنی آخرت سنوارنے کی فکر کریں۔

یہ شاگرد اللہ کے مہمان ہیں:

یہ شاگرد یہ نعمت اللہ نے تمہیں دی ہے ان کی قدر کیجئے، آپ یہ سوچیں کہ مجھے جو آتا ہے وہ کم از کم انہیں آجائے، اور ان کے ساتھ اچھا معاملہ رکھیں ممکن ہے یہی موقع ہو آپ کی آخرت سنوارنے کا، ہم نے جن اساتذہ سے پڑھا ہے، ہم نے انکا حال دیکھا ہے ان کی نظر سب پر ہوتی تھی، اور وہ تنخواہ صرف اس دن کی لیتے تھے جس دن سبق پڑھاتے تھے، باقی کی کوئی تنخواہ نہیں تو بھی بڑی ذمہ داری سے یہ فریضہ انجام دینا چاہئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص وذمہ داری کے ساتھ یہ فریضہ نبھانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

﴿ مورخہ ۱۲ / مئی ۲۰۱۰ء بروز بدھ بعد نماز ظہر ﴾

الحمدلله الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتو كل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده اللّٰه فلا مضل لهٗ ومن يُضلِله فلا هادي لهٗ ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا وحبيبنا ومولانا محمداً عبدهٗ ورسولهٗ صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وعلى آله وصحبه وبارك وسلم تسليماً كثيراً امابعد! فاعوذ باللّٰه من الشيطٰن الرجيم بسم اللّٰه الرحمن الرحيم ﴿ الرحمن علم القرآن﴾ وقال رسول الله ﷺ خيركم من تعلم القرآن وعلّمه، آمنت بالله وصدق الله مولانا العظيم وصدق رسوله النبي الكريم ونحن على ذالك من الشاهدين والشاكرين والحمد لله رب العالمين.

قابلِ صد احترام حضرات اساتذہ و معلمین اور محترم معلمات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سب سے پہلے میں ان حضرات کو اپنے دل کی گہرائی سے مبارکباد پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس تربیتی اجتماع کی ضرورت محسوس کی اور اس کے انعقاد کا انتظام فرمایا۔

تعلیم کا کام بڑا کام ہے، عظیم الشان کام ہے، اس کی اہمیت نا قابلِ تصور ہے اور اس کے ثمرات کا کوئی احاطہ نہیں کیا جا سکتا یہ مردُم سازی کا کام ہے۔ یہ آدم گری کا کام ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے دنیا میں اور ہمارے ملک میں ہزاروں دینی ادارے قائم ہیں جو بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس پر ہم اللہ رب العزت کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ ہمیں آزادنہ طریقہ سے تعلیم کے کام میں زیادہ سے زیادہ اپنی خدمات بروئے کار لانے کا موقع میسر ہے۔

جن ممالک میں اس پر پابندی ہے وہاں کی صورت حال اس قدر ابتر ہے کہ تصور نہیں کیا جا سکتا

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۲؍مئی ۲۰۱۰ء بروز بدھ بعد نماز ظہر﴾

الحمدلله الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل لهٗ ومن يُّضلِله فلا هادي لهٗ ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا وحبيبنا ومولانا محمداً عبدهٗ ورسولهٗ صلى الله تعالىٰ عليه وعلى آله وصحبه وبارك وسلم تسليماً كثيراً امابعد! فاعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم ﴿الرحمن علم القرآن﴾ وقال رسول الله ﷺ خيركم من تعلم القرآن وعلّمه، آمنت بالله وصدق الله مولانا العظيم وصدق رسوله النبي الكريم ونحن على ذالك من الشاهدين والشاكرين والحمد لله رب العالمين.

قابلِ صد احترام حضرات اساتذہ و معلمین اور محترم معلمات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سب سے پہلے میں ان حضرات کو اپنے دل کی گہرائی سے مبارکباد پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس تربیتی اجتماع کی ضرورت محسوس کی اور اس کے انعقاد کا انتظام فرمایا۔

تعلیم کا کام بڑا کام ہے، عظیم الشان کام ہے، اس کی اہمیت نا قابل تصور ہے اور اس کے ثمرات کا کوئی احاطہ نہیں کیا جا سکتا یہ مردم سازی کا کام ہے۔ یہ آدم گری کا کام ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے دنیا میں اور ہمارے ملک میں ہزاروں دینی ادارے قائم ہیں جو بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس پر ہم اللہ رب العزت کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ ہمیں آزادنہ طریقہ سے تعلیم کے کام میں زیادہ سے زیادہ اپنی خدمات بروئے کار لانے کا موقع میسر ہے۔

جن ممالک میں اس پر پابندی ہے وہاں کی صورت حال اس قدر ابتر ہے کہ تصور نہیں کیا جا سکتا

کس قدر دخل ہے؟ تو یہ کام کہیں نہیں ہو رہا، حالانکہ اس طرح محاسبہ اور اس طرح کی مشاورت بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

ہم سب دیکھتے رہتے ہیں کہ ماشاء اللہ یہ دعوت وتبلیغ کا کام محلّہ محلّہ ہوتا ہے تو ہر مسجد میں کچھ فکر مند حضرات ہر ہفتہ ایک دفعہ یا ایک سے زیادہ دفعہ جمع ہوتے ہیں۔ مشورہ کرتے ہیں کہ کام کی سطح کیا ہے؟ پہلے کیا صورت حال تھی؟ اب کیا ہے؟ کیا کیا مشکلات ہیں؟ کیا آسانیاں متوقع ہیں؟ کام کو بڑھانے کے کیا طریقے ممکن ہیں؟ دیکھئے یہ فکر نتیجہ خیز ہوتی ہے اور کام بڑھتا چلا جاتا ہے۔ رکاوٹیں کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مقصد کا احساس زیادہ سامنے آنے لگتا ہے۔ خیر کا کام بڑھنے لگتا ہے۔

ہمارے مدارس میں، میں سمجھتا ہوں اس کا فقدان ہے، اس لئے اگر اس طرح کی مشاورت ہونی لگے تو میں سمجھتا ہوں کہ بڑی برکت کی بات ہوگی۔

میں اور آپ سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور کم سے کم میں اپنی ذات کی نسبت سے یہ نہیں سمجھتا کہ میں آپ کے سامنے کوئی ایسا گر، ایسا فارمولا، اور ایسا نسخہ پیش کرسکوں گا کہ جس کے ذریعہ کایا پلٹ جائے۔ ہم سب محتاج ہیں اور اپنے کام کو زیادہ سے زیادہ بہتر کرنے کی ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت ہے۔ اور تعلیم کا معاملہ ہے بھی ایسا، میں نہیں سمجھتا کہ کسی کے پاس بھی کوئی ایسا نسخہ ہوگا کہ ایک دم رات دن میں بدل جائے اور سیاہ سفید ہو جائے۔ ایسا انقلابی نسخہ تعلیم کے میدان میں دستیاب نہیں، معجزات اور کرامات کے درجہ میں بھی خال خال کوئی صورت ہو تو ہو، عام طور پر تو یہ دنیا دار الاسباب ہے اور تعلیم کے میدان میں تو خاص طور پر جہد مسلسل کی متقاضی ہے تو اس لئے کوئی ایسا نسخہ یا کوئی ایسی راہ عمل یا ایسی ترکیب وتدبیر جس کے نتیجہ میں ایک دم انقلاب آجائے اس کی توقع میں سمجھتا ہوں خوش فہمی ہے۔ تعلیم کا کام لوہے کے چنے چبانا ہے، محنت کرنا ہے مسلسل تگ ودو میں مشغول رہنا ہے۔

مقصد کا استحضار اور اپنے طرز عمل کا محاسبہ کرنا ہے۔

یہ لگن، یہ فکر، یہ جستجو، یہ طلب، یہ جذبہ اور یہ احساس، اگر اجاگر ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ راستہ کھل جاتا ہے، لیکن اگر اس درجہ کی بات نہیں ہوتی تو گویا کہ بس رواروی کا سا کام ہے ایک رسمی انداز ہے۔ مدرسے آئے دن بنتے رہتے ہیں طلبہ کا بھی اللہ کے فضل وکرم سے اچھا خاصا رجوع ہے۔ نصاب بھی موجود ہے۔ امتحانات کا بھی نظم ہے۔ سالانہ سات، آٹھ، نو ہزار علماء فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔

بارہ، تیرہ، چودہ ہزار طالبات فارغ التحصیل ہوتی ہیں ایک سلسلہ ہے جو رواں دواں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر طرف ظلمت ہے، تاریکی ہے اور کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اتنی بڑی فوج ظفر موج ہر سال ان مدارس سے نکلتی ہے لیکن اس کے کچھ اثرات وثمرات نظر نہیں آتے۔ یہ ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ اور بس یہی فکر، یہی احساس اگر پیدا ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ چراغ روشن ہو جائے گا۔ اور اپنے کاموں کو زیادہ سے زیادہ بہتر کرنے کی انشاء اللہ سبیل نکل آئے گی۔

میں اپنے تقریباً بیالیس تینتالیس سالہ تدریسی زندگی میں جو چیز محسوس کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ

اچھی تعلیم اور نتیجہ خیز تربیت کے لئے دل جمعی اور یکسوئی ناگزیر بنیاد ہے۔

اگر استاد میں یکسوئی نہ ہو تو طالبعلم کچھ حاصل نہیں کر پاتا اور اگر طالبعلم میں یکسوئی نہیں ہے تو اچھے سے اچھے استاد کی تعلیم اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے اور وہ کچھ فائدہ نہیں اٹھاتا۔ دل جمعی، یکسوئی، جستجو، فکر مندی، اور مسئولیت کا احساس کامیاب مدرس کے لئے بنیادی اور اساسی شرط ہے۔ البتہ یہ غور طلب بات ہے کہ یکسوئی، دل جمعی، حاصل کیسے ہوتی ہے؟

یہ میں نے شروع میں آپ حضرات کے سامنے عرض کیا کہ میں کوئی ایسا فارمولا آپ کو دینے کا اہل نہیں ہوں جس کے نتیجہ میں کایا پلٹ جائے۔ یہ ایک مذاکرے کی مجلس ہے۔ جب محترم بھائی یامین صاحب نے حکم دیا تھا کہ اس مذاکرے میں حصہ لینا ہے مجھے ایک دن یہ بھی خیال آیا تھا کہ میں حاضر ہو جاؤں گا اور چونکہ ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں تو ہم سب مذاکرہ کریں گے کہ ہر ایک استاد کے سامنے طلبہ ہوتے ہیں، درس گاہ ہوتی ہے، ہر ایک درس وتدریس کے ماحول سے گزر رہا ہوتا ہے، ہر ایک مشکلات کو سمجھتا ہے اور ہر ایک کی زندگی میں اچھے اچھے تجربات بھی سامنے آتے ہیں تو مذاکرے کے طور پر ہر ایک اپنی کچھ آپ بیتی یا اپنے سامنے کچھ آنے والی مشکلات کا اظہار کرے اور اس پر باہمی طور پر گفتگو کی جائے۔ یہ بھی طریقہ ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے دوروں میں اگر اس کے لئے بھی کوئی وقت مختص کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

کسی ایک نے کسی طرح کی مشکلات کا سامنا کیا ہوگا، کسی دوسرے نے کسی اور طرح کی مشکلات کا سامنا کیا ہوگا، درس کی نسبت سے، یا طالبعلم کی نسبت سے، یا خارجی ماحول اور خارجی حالات کی نسبت سے جس کی وجہ سے تعلیم کا مقصد متاثر ہوا ہوگا اور جو اچھے ثمرات اور اثرات سامنے آئے ہونگے

تو اس سے بھی ایک رہنمائی ملتی ہے اور فائدہ حاصل ہوتا ہے، مستقبل میں کوئی ایسی صورت سامنے ہو تو میرے خیال میں ایک حصہ اس کا بھی ہونا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ

کام بہت اہم ہے اس کی اہمیت کے لئے ضروری ہے کہ ہر ادارہ میں اجتماعی طور پر اصلاح حال کے لئے سوچ پیدا ہو، اور مشاورت کا سلسلہ شروع ہو۔

وامرھم شوریٰ بینھم

یہ صاحب ایمان لوگوں کی زندگی کا ایک ضابطہ ہے **وامرھم شوریٰ بینھم** تو تعلیم کا معاملہ بھی کم اہمیت کا نہیں۔ بہت بڑے مقصد کا معاملہ ہے۔ قدم قدم پر مشکلات آتی ہیں، رکاوٹیں آتی ہیں، انسان کو خیال آنے لگتا ہے کہ جو کوشش میں کر رہا ہوں یہ کہیں سعی لا حاصل تو نہیں ہے؟ العیاذ باللہ۔ خدانخواستہ، خدانخواستہ ہم اس کا مصداق تو نہیں بن رہے؟

الذین ضل سعیھم فی الحیاۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا

اس لئے ہر ادارے میں ایسا مشورہ ہونا چاہیے اس کے انشاء اللہ اچھے فوائد ظاہر ہونگے۔

میں کوئی متعین فارمولا تو پیش نہیں کر سکتا لیکن اپنی زندگی میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں اور مجھے جو حالات سے اندازہ ہوا ہے وہ یہ کہ

اچھے معلم، اچھی معلّمہ، کامیاب مدرس، کامیاب مُدرِّسہ کے لئے یکسوئی، مسئولیت کا احساس لگن، شوق، جستجو کامیابی کی اساس ہے

اور اس اساس کی بنیاد کیا ہے؟ سب سے پہلی بنیاد ہے اچھی استعداد۔ اگر اچھی استعداد ہوگی تو جستجو بھی پیدا ہوگی، لگن بھی پیدا ہو سکتی ہے، شوق بھی پیدا ہو سکتا ہے، تعلیم وتربیت کا بہت ہی دقیقہ رسی کے ساتھ احساس بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن اگر استعداد کمزور ہے تو سوائے تذبذب کے، تردد کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اور پھر وہ افسردگی، وہ تردد، وہ تذبذب ان طلبہ میں منتقل ہو جاتا ہے اس لئے بنیادی استعداد اور علمی رسوخ یہ ایک لازمی عنصر ہے۔

ایک استاد کو اگر صَرف کے بارے میں اتنا عبور حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بھی صیغے کی تحلیل کر سکے تحلیل سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو ہیئت کذائیہ ہے اور اس کے جو حروف اصلیہ ہیں اور صحت وسقم کے اعتبار سے جو اس کی حالت ہے اگر اس کو سمجھنے اور پہچاننے کی صلاحیت نہیں ہے تو ایسا مدرس سوائے طلبہ کو مشوش کرنے کے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ نحو وصَرف یہ دو چیزیں اگر طالبعلم کی صحیح ہو جائیں تو آگے اس کے لئے راستہ کھل جاتا ہے۔

نحو ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہے۔ قواعد پڑھائے جاتے ہیں، ازبر کرائے جاتے ہیں۔ لیکن طالبعلم جب عبارت پڑھ رہا ہوتا ہے آپ درجہ ثانیہ سے لے کر دورہ حدیث تک مدارس کا سروے کر کے دیکھیں گے میں سمجھتا ہوں کہ ۸۰ فیصد طلبہ کو عبارت پڑھنا نہیں آتی۔ وہ نحوی اور صرفی قواعد کا انطباق نہیں کر سکتے۔ عبارت میں وہ چاہے فقہ کی عبارت ہو چاہے حدیث کی عبارت ہو۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ۸۰ فیصد۔ اور وہ ۲۰ فیصد اگر مطالعہ کریں تو قواعد کا ان کو استحضار ہے اور اس کی تطبیق پر ان کو قدرت ہے تو ان میں بھی مختلف قسم کی درجہ بندیاں ہوں گی اور یہ ۸۰ فیصد وہ طلبہ ہیں جو ادنیٰ سے لے کے انتہائی سطح تک صرف نحو بلاغت، ہر طرح کے فنون سے گزر چکے ہوتے ہیں لیکن بس رواروی کا سا انداز ہے۔ سرسری پن ہے۔ ایک عادت سی بن گئی ہے کہ نحو میر پڑھنی ہے اس کے بعد ہدایۃ النحو ہے اس کے بعد کافیہ ہے اس کے بعد شرح جامی ہے اور میزان ومنشعب ہے اور علم الصیغہ ہے اور پھر کہیں شافیہ بھی ہے۔ اور اصول الشاشی ہے، نورالانوار ہے، حسامی ہے، ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب دوسری کتاب کے بعد تیسری کتاب۔ گنتی میں تو ساری کتابیں آجاتی ہیں لیکن معنویت کے لحاظ سے اگر ہم دقیقہ رسی سے جائزہ لیں، تو افسوسناک حالت اور بڑا لمحہ فکر یہ ہے۔ تو اصل بات یکسوئی اور دل جمعی کی ہے۔ یکسوئی اور دل جمعی کا فقدان اس وجہ سے ہے کہ استعداد کمزور ہے۔

اب استعداد کو بہتر بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ ایک تو بہتر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ طالبعلمی کے دور سے اولیٰ سے پوری توجہ ہو استاد کی بھی اور طالب علم کی بھی۔

اور پھر صرف خواندن برائے خواندن نہ ہو بلکہ سمجھ کر پڑھا جائے اور احقر کا تجربہ ہے کہ صرفی اور نحوی قواعد کے اجرا کا بہتر طریقہ جس سے طالبعلم کو صحیح معنی میں فائدہ حاصل ہو وہ محض قواعد کو ذہن نشین

کرانا نہیں ہے۔ بلکہ عملی طور پر ان کا اجرا اور تطبیق ہے۔ مثلاً ایک چھوٹی سی مثال میں آپ کو بتاتا ہوں یہ ایک مختصر سا جملہ ہے:

الناس اعداء لما جهلوا

تو آپ شرح جامی کے کسی طالبعلم سے اس کی ترکیب پوچھیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ ترکیب بتانے پر قادر ہوں لیکن میرے سامنے ایسی مثالیں ہیں جو ''فی الدار رجل'' کی ترکیب نہیں بتاسکتے وہ ''فی الدار رجل'' کی ترکیب میں کہتے ہیں، فی مضاف، دار مضاف الیہ مبتدأ، رجل اس کی خبر اور اگر کہیں درست ترکیب میں کامیاب ہوجائے کہ فی الدار خبر مقدم ہے اور رجل مبتدا مؤخر ہے لیکن اگر آپ اس کو معکوس کر کے پوچھیں ''رجل فی الدار'' کی کیا ترکیب ہے تو دونوں میں فرق نہیں کرسکتے وہ بھی جملہ خبریہ ہے اور یہ بھی جملہ خبریہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قواعد تو سب پڑھ لیے لیکن ممارست نہیں ہے، تمرین نہیں ہے، اجرا نہیں ہے، قواعد کا انطباق نہیں ہے، اجرا پر اس کی قدرت نہیں۔

الناس اعداء لما جهلوا یہ ایک جملہ ہے آپ ترکیب پوچھیں گے تو بہت سے لوگ ترکیب صحیح بتاسکیں گے لیکن اگر تحلیل کر کے یہ معلوم کرنا چاہیں کہ بتائیں۔ الناس اسم ہے یا فعل ہے یا حرف ہے اس کے ذہن کو جھنجوڑیں اسم ہے تو کیوں؟ فعل ہے یا نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ حرف ہے یا نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ اس انداز کا فلسفہ نہایت مفید ہے لیکن نحو میں جو دوسرے انداز کا فلسفہ ہوتا ہے وہ ایک ذہنی عیاشی ہے۔ جب قواعد پر پوری طرح دسترس حاصل ہو تو الناس کے بارے میں پوچھ لیں، پھر یہ پوچھیں کہ معرب ہے یا مبنی ہے مؤنث ہے یا مذکر ہے متمکن ہے یا غیر متمکن ہے۔ منصرف ہے غیر منصرف ہے، جمع ہے مفرد ہے؟

یہ سارے قواعد جو طالبعلم نے پڑھے ہیں ایک لفظ میں آدھی کتاب کا اجرا ہوجاتا ہے۔

''لما'' کیا کلمہ ہے یہ جو لام ہے یہ کیا ہے اور ''ما'' کیا چیز ہے ''ما'' نافیہ بھی ہوتا ہے ''ما'' موصوفہ بھی ہوتا ہے ''ما'' موصولہ بھی ہوتا ہے ''ما'' زائدہ بھی ہوتا ہے یہ ''ما'' کیا چیز ہے ''جهلوا'' یہ کون سا صیغہ ہے۔ اس کا باب کیا ہے باب ظاہر ہے لیکن ہر ایک آدمی کو اس کا ادراک نہیں ہوتا یہ صحیح ہے یا غیر صحیح ہے۔ اس طرح سے تحلیل کر کر کے اگر اجرا ہوگا تو نحوی اور صرفی قواعد کا فائدہ نظر آئے گا۔

اگر قواعد رٹ لئے لیکن اجرا ممارست اور تمرین کا انداز نہیں ہے تو اس کا کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہوگا۔

یہ جو شروع میں میں عرض کر رہا تھا کہ یکسوئی کا فقدان ہے استاد کو فکر ہوتی ہے کہ کتاب ختم کرانی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ قاعدہ بھی از بر کرایا جائے۔ یہ ہر فاعل مرفوع ہوتا ہے اور ہر مفعول منصوب ہوتا ہے تو بس یہ قاعدہ دماغ میں آ گیا جملہ اسمیہ اس کو کہتے ہیں کہ جس کا پہلا جز اسم ہو اور جملہ فعلیہ اس کو کہتے ہیں جس کا پہلا جز فعل ہو بس، اس کا عملی انطباق بہت سے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا جس وجہ سے جب صرف اور نحو میں ضعف رہ جاتا ہے.......... تا ثریا می رود دیوار کج

تو ابتدائی درجات کے بعد کوئی موقع ایسا نہیں آتا کہ اس کا تدارک ہو سکے۔ کتنی مشکل بات ہے یہ خشت اول جب ٹیڑھا ہو جاتا ہو تو آخر تک یہ کجی برقرار رہتی ہے۔ وجہ کیا ہے کہ یکسوئی دل جمعی کا فقدان ہے استعداد کی کمزوری ہے جستجو کی کمی ہے۔طلبہ کو بنانے اور ان کے دماغ میں اتارنے اور ان کو اس قواعد کے بارے میں پوری طریقہ سے تمرین سے آراستہ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔ کتاب پوری ختم ہو جاتی ہے لیکن اگر ہم حاصل محصول کا تتبع و جستجو کریں گے تو کچھ ثمرہ نظر نہیں آئے گا۔ اس لئے یہ بات بہت زیادہ ضروری ہے کہ ایک استاد اپنے منصب کا احساس کرے کہ ایک بہت بڑی امانت مجھ سے وابستہ ہے۔ اور اس امانت کے سلسلے میں مجھے عند اللہ اپنی مسئولیت کو صحیح طریقہ سے بروئے کار لانا ہے۔

تدریس کی نافعیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ

درس گاہ میں جانے سے پہلے مضمون پر پوری طرح عبور حاصل ہو۔

انشراح اگر ہوگا تو خود اعتمادی پیدا ہوگی اور خود اعتمادی پیدا ہوگی تو ''از دل خیزد بر دل ریزد'' بات اوقع فی النفس ہوگی۔ اگر تذبذب ہوگا، ناپختگی ہوگی، اس مضمون پر استاذ پوری طرح حاوی نہیں ہوگا، پوری طریقے سے دسترس حاصل نہیں ہوگی تو اس کے نتیجہ میں جو بات نکلے گی وہ بات ڈھیلی ڈھالی نکلے گی اور جب بات ڈھیلی ڈھالی نکلے گی تو اس کا اثر کا بھی ڈھیلا ڈھالا ہوگا۔ رنگ نہیں چڑھے گا۔

یہ بنیادی بات ہے اچھی استعداد، جستجو اپنی مسئولیت کا احساس، اس بات کا احساس کہ یہ جو میرے سپرد امانت ہے۔ مجھے اس کی حفاظت بھی کرنی ہے اور اس کو مزید پروان بھی چڑھانا ہے۔ یہ احساس اگر ہوگا ان شاء اللہ تو پھر اس کے اثرات وثمرات نظر آئیں گے اور، روا روی کا معاملہ ہوگا تو

رواروی کا معاملہ نتیجہ خیز نہیں بنے گا۔

ایسے اسباب سے اپنے آپ کو نکالنا چاہیے جو یکسوئی اور دل جمعی میں مزاحم بنیں

اگر مدرس ہے تو بالکل مُلّا بن کر اس کو تدریس کا کام کرنا چاہیے اور اگر وہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھے گا تو نہ اِدھر کا رہے گا نہ اُدھر کا رہے گا۔ اِلا یہ کہ کسی کی استعداد بہت ہی غیر معمولی ہو تو ٹھیک ہے۔ جزوی طور پر کسی کام میں حصہ لینا شاید زیادہ مفید نہ ہو۔

مضمون پر حاوی ہونا ضروری ہے۔

اور جب مضمون پر حاوی ہونے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جو سبق آج ہمارے سامنے ہے اس کے کتنے عناصر ہیں، کتنے اجزاء ہیں۔ ہر ہر جزء کے بارے میں پوری بصیرت حاصل ہو اور اس کا بھی خیال ہو کہ میرے سامنے جو طلبہ ہیں مختلف فہم رکھنے والے ہیں۔ اُن کی سوچ وفکر اور ان کا جو اخذ کا مادہ ہے وہ یکساں نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے اضعف کی رعایت کر کے اپنی بات پیش کرنی ہے۔ اضعف کی رعایت کر کے اور اس کے مقابلے میں جو قوی ہے اس کے ذہن میں یہ اشکال پیش آسکتا ہے۔

لہٰذا سبق کی تیاری کے دوران اس بات کو بھی پیش نظر رکھے لیکن طالبعلموں کو اتنا دے جتنا وہ ہضم کرسکیں اپنی تیاری پوری ہو لیکن جہاں تک منتقل کرنے کا معاملہ ہے اور دینے کا معاملہ ہے وہ قابل تحمل ہو۔ اپنا مطالعہ، اپنی تیاری، اور اپنا جو سامان ہے اس میں کوئی کمی نہ ہو۔ ایسے میں جب استاد تیار ہو کے درس گاہ میں جا کے بیٹھے گا تو بخدا دل سے بات نکلے گی، اثر انداز ہوگی، خود اعتمادی سے نکلے گی، پوری بصیرت سے نکلے گی، اور یقینی طور پر اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

یہ جو ہوتی ہے ناقص تیاری، اس کے بڑے منفی اثرات ہوتے ہیں مضمون اچھا خاصا آسان ہوتا ہے لیکن ناقص تیاری سے طالبعلم کی نظر میں وہ پہاڑ بن جاتا ہے۔

سیدھا سادہ مضمون ہے اگر مناسب اسلوب کے ساتھ اس کو پیش کیا جاتا، تیاری کے بعد اور جب تیاری ہوتی ہے تو ذہن میں بھی یہ بات آتی ہے کہ اس کو زیادہ سہل طریقہ سے پیش کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ جب یہ تیاری ہوگی تو سہل طریقہ سے پیش کرنے کا ایک داعیہ پیدا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بھی مدد آئے گی۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

اللہ تعالیٰ بھی اس کو راستے بجھا دیتے ہیں۔ وہ مشکل پھر آسان ہو جاتی ہے بات اثر انداز ہوتی ہے لیکن جب تیاری نہیں ہوتی تو ایسی صورت میں بس وقت گزاری کا انداز ہوگا۔ اس وقت گزاری کے انداز نے آج یہ صورت حال ہے کہ تقریباً ۷۰، ۸۰ فیصد ہمارے فضلاء اس پایہ کے نہیں ہیں جس پایہ کا ان کو ہونا چاہیے۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ جو مدارس ہیں جیسے کہ شروع میں میں نے عرض کیا کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے اللہ کی اور اس لئے بھی نعمت ہے کہ یہ علوم نبوت کے تحفظ کا بڑا ذریعہ ہیں۔ بڑا ذریعہ کیا بلکہ واحد ذریعہ ہیں۔ دنیا میں کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے۔ کوئی حکومت ایسی نہیں ہے۔ کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے۔ کوئی جماعت ایسی نہیں ہے۔ جو تعلیم کے کام کا بیڑا اُٹھاتی ہو جبکہ علوم نبوت کی تعلیم دین کے ہر شعبہ کے لئے ناگزیر ضرورت ہے۔

دعوت و تبلیغ کے کام کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے۔ جہاد کے کام کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے۔ زندگی کے دیگر میدانوں میں اگر کوئی شخص دینداری کے طریقہ پر چلنا چاہے تو اس کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے۔ علم ہر جگہ ناگزیر ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کے لئے اللہ رب العزت نے ہمیں یہ مدارس کا نظام عطا فرمایا اور یہ نظام ویسے تو شروع سے رہا ہے ہر دور میں اس کا الگ طریقہ رہا ہے۔ جب انگریز اس برصغیر میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی دہلی میں بہت سارے مدارس تھے۔ انگریز نے آ کر سب کو ملیامیٹ کر دیا اور کفار کی یہ خواہش کہ برصغیر سے مسلمانوں کو دیس نکالا دیا جائے اور بحیثیت امت کے ان کو فنا کر دیا جائے اور چونکہ امت کی شناخت دین سے ہے، علوم نبوت سے ہے، قرآن کریم سے ہے۔ تو انگریز کی پوری کوشش تھی بہرحال اس کوشش میں تو اللہ کے فضل و کرم سے اس کو اس درجے میں تو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے خلاف مسلح جدوجہد کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا اور وہ جدوجہد بھی جب ناکام ہوگئی تو ہمارے بزرگوں نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کے دین و ایمان کے تحفظ کے لئے اب ہمارا میدان عمل تعلیم کا میدان ہے۔

ایک درخت کے نیچے ایک استاد اور ایک شاگرد سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند اس طرح نہیں بنا تھا کہ کوئی عمارت تیار کی گئی کچھ لوگوں کو جمع کیا گیا اس کے

لئے باقاعدہ ایجنڈا بنا کوئی فنڈ مہیا کیا گیا، مدرسہ کا آغاز ہوا تھا چھت کے بغیر ایک درخت کے سائے میں ایک استاد اور ایک طالبعلم سے اور پیش نظر یہ تھا کہ علوم نبوت کا تحفظ کیا جائے۔ یہ پہلا مورچہ تھا علوم نبوت کے تحفظ کا جو درخت کے سائے میں بنا تھا۔ اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے بزرگ اس مورچے کے مقاصد میں کامیاب رہے۔

الحمدللہ اس طاغوت کے دور میں بھی اللہ کے فضل وکرم سے بڑے بڑے علماء راسخین اور علمائے ربانیین اس امت کی رہنمائی کے لئے پیدا ہوئے لیکن کفر نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اُس وقت کفر کا حملہ دوسری نوعیت کا تھا آج کفر کا حملہ زیادہ ہمہ گیر ہو گیا ہے۔ پہلے تو ایک مخصوص شکل تھی سیاسی بالادستی کی۔ اب جو کفر کا حملہ ہے وہ اعتقادی بھی ہے فکری بھی ہے معاشی بھی ہے اور سیاسی بھی ہے غرض ہر لحاظ سے ہمہ جہتی یلغار ہے امت مسلمہ پر۔

اور اس امت مسلمہ کے تحفظ اور علوم شریعت کے تحفظ کے لئے اور کوئی مورچہ نہیں سوائے مدارس کے۔ اس زمانے میں یہ مورچہ بنا تھا اور یہ مورچہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا۔ اب کفر زیادہ سفاکانہ انداز میں ہم پر حملہ آور ہے اور مختلف ہتھیاروں سے ہم پر حملہ آور ہے۔ مختلف جہات سے ہم پر حملہ آور ہے اور وہ جو مورچہ ہمارے پاس ہے بجائے اس کے کہ وہ مورچہ مضبوط ہوتا وہ کمزور ہوتا جارہا ہے۔ جو اصل کام تھے ان مدارس کے ان میں بھی ضعف آ گیا ہے۔ اچھی استعداد کے طلبہ پیدا نہیں ہوتے حالانکہ یہ بات نہیں ہے کہ پہلے زمانے کے لوگوں کا دماغ کچھ زیادہ عالیشان تھا اور اب طبعی اور فکری طور پر ان میں ضعف آ گیا ہے ایسا نہیں۔

سنت اللہ بھی ایسی نہیں ہے کہ پچھلے لوگ زیادہ قوی ہوں اور بعد کے لوگ کم فہم ہوں اور گویا کہ کم ذہن کے مالک ہوں ایسا نہیں ہے۔

البتہ پہلے لوگوں نے ذمہ داری سے کام کیا تھا:

وان لیس للانسان الا ماسعیٰ، الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

تو اس کے ثمرات ظاہر ہوگئے اور اب اُتنی ذمہ داری سے کام ہو نہیں رہا۔ جہاں ہوتا ہے وہاں اس کے ثمرات ظاہر ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بعض مدارس میں حفظ کا شعبہ ہوتا تھا وہاں تکمیل حفظ میں آٹھ سال لگتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بچے ذہنی اور دماغی ماؤف ہوتے تھے بلکہ بدنظمی تھی اس

لئے وہ کام جو کم وقت میں ہوسکتا تھا وہ اتنا وقت لے لیتا تھا اور یہ وقت کا بے دریغ استعمال تھا حالانکہ اس مجموعی وقت میں دین کے بڑے بڑے کام ہوسکتے تھے لیکن اس عرصہ میں تھوڑا سا کام ہوتا تھا۔ لیکن اس لحاظ سے کم وقت میں وہ کام ہوسکتا تھا جس کے لئے آٹھ آٹھ سال گزار دیئے اوراب آپ کو معلوم ہوگا کہ تعلیم کے میدان میں نئے نئے تجربات ہورہے ہیں۔ ایک سال میں، دوسال میں، عام طور پر تو ڈھائی سال میں بچہ حافظ ہوجاتا ہے۔ کم ذہن کا ہو یا کم توجہ، جس کی وجہ سے اس کا وقت زیادہ لگتا ہوگا ورنہ دو، ڈھائی سال میں آسانی سے بچہ حفظ کرلیتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ پچھلے زمانوں کے لوگ زیادہ عبقری تھے اوراب اس زمانے کے لوگ ذہنی طور پر کمزور ہیں۔ لیکن فرق جو ہے وہ رویہ کا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگوں میں دل جمعی تھی، یکسوئی تھی، لگن، جستجو، اپنی ذمہ داری کا احساس اور طلبہ کو امانت سمجھنے کا اعتقاد، اوراب سرسری پن ہے، رواروی ہے، رسمی سا انداز ہے چالو سا کام ہے۔ نتائج پر اور بنانے پر زیادہ نظر نہیں ہے چنانچہ جو نتائج سامنے آنے چاہئیں وہ سامنے نہیں آرہے۔

معمولی بات نہیں ہے کہ ہمارے مدارس میں پندرہ لاکھ بچے پڑھ رہے ہیں لیکن ایسے مدارس خال خال ہوگئے کہ ان کے بارے میں جب سنتے ہیں تو ایک خوشگوار احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسے ادارے کم ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ ہر ایک کا عمل ہے ایک رویہ ہے لگن کی کمی ہے شوق کی کمی ہے اپنی استعداد کی کمزوری ہے اوراپنے طریقہ کار کا ضعف ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم بہت سے اسباب کی نشاندہی کرسکتے ہیں یہ سبب ہے، وہ سبب ہے، ایسا ممکن بھی ہے۔ لیکن تمام اسباب ایک طرف اوراپنے تجربے کی بناء پر عرض کرتا ہوں کہ یہ ایک سبب تمام اسباب کی ماں ہے۔

یکسوئی، دل جمعی، جستجو، طلب، لگن، احساسِ ذمہ داری، یہی تمام اسباب کی ماں ہے یہ سبب اگر اُجاگر ہوجائے تو حالات بدل جائیں گے۔

حضرات اساتذہ اپنے حالات کا جائزہ لیں، اپنی لگن کو زندہ کریں، اپنے اس شوق کے چراغ روشن کریں۔ اور جب یہ چراغ روشن ہوگا تو پھر یہ کیفیت اپنے طلبہ میں منتقل کرسکیں گے اور اگر اس یکسوئی، دل جمعی کے لئے کوئی خارجی موانع ہیں، خارجی اسباب ہیں، تو ان اسباب کا جس سے بھی

تعلق ہے ان کے ازالے کی فکر کریں تا کہ تعلیم کا یہ کام زیادہ ذمہ داری کے ساتھ اور زیادہ یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ ہو اور یہ سب باتیں صرف زبانی جمع خرچ کی نہیں ہیں۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض

یہ آیت ایسے ہی طلبہ اور مشتغلین فی العلم سے متعلق ہے احصروا فی سبیل اللہ، کہ اللہ کی زمین میں ان کو قید کر دیا گیا تھا لا یستطیعون ضرباً فی الارض زمین میں چل پھر نہیں سکتے تھے اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ خدانخواستہ اپاہج تھے دشمن نے ان کو نرغے میں لیا تھا بلکہ مطلب یہ ہے خود انہوں نے اپنے اختیار سے اپنے آپ کو ایسا کر لیا تھا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

العلم لا یعطیك بعضه حتی تعطیه كلك

علم کا معاملہ، تعلیم کا معاملہ، تربیت کا معاملہ، قوم کو بنانے کا معاملہ، مسلمانوں کی اولاد کو سنوارنے کا معاملہ اور ان کو دین وعمل سے آراستہ کرنے کا معاملہ بڑی اہمیت کا معاملہ ہے

اور اگر اس اہمیت کا ہم کو احساس ہو جائے اور میں سب سے پہلے اپنے آپ کو مخاطب کرتا ہوں۔ تو انشاء اللہ ہمارے رویوں میں تبدیلی آئے گی اور اس کے ثمرات ظاہر ہونگے۔ اس کے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اس لئے ہمیں اپنے گریبان میں سر ڈال کے، اپنے حالات کا جائزہ لے کر، اپنا محاسبہ کر کے خود اپنے لئے راہ عمل متعین کرنی چاہیے۔

اور بھی بہت سارے اسباب ہونگے اور آپ کے سامنے آ گئے ہونگے اور آئندہ بھی آئیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بنیاد ہے جستجو، طلب، ذمہ داری کا احساس، یکسوئی، دل جمعی، بننے اور بنانے کا جذبہ، یہ بات جتنی قوی ہوگی اس کے اتنے ثمرات ظاہر ہونگے اور اس میں جتنا تخلف ہوگا اسی نسبت سے گویا کہ اس کے مفاسد سامنے آئیں گے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ طلبہ شکایت کرتے ہیں کہ صاحب فلانے استاد کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یا جو سبق انہوں نے پڑھایا ہے وہ سمجھ میں نہیں آیا تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ استاد یہ سمجھتا ہے کہ بس ٹائم گزارنا ہے۔ ہر طالبعلم میں نہ اتنی ہمت ہوتی ہے نہ اسقدر تنبہ ہوتا ہے کہ وہ استاد کی بات کو پکڑ سکے

یا کچھ اشکال کر سکے۔ یعنی مجموعی طور پر تساہل کا ماحول ہے آرام طلبی کا ماحول ہے اور تکاسل کا ماحول ہے جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ پھر سبق کیسے سمجھ میں آئے گا۔ آسان سبق بھی طالب علم کے لئے پہاڑ بن جاتا ہے۔ جب مخلصانہ کوشش ہوگی تو سمجھ میں آئے گا۔ سرسری انداز ہوگا تو سبق کیسے سمجھ آئے گا جو دنیا کا نظام ہے وہ تقسیم کار کا ہے۔ اللہ رب العزت نے ہمیں پہرہ دار بنایا ہے اپنے دین کا۔ یہ رباط ہے رباط، اس رباط کی نزاکت کا احساس کریں اور ذمہ دارانہ پہرہ دیں تو انشاء اللہ اس کے اثرات ظاہر ہونگے لیکن اس رباط کو اگر ہم نے ذمہ دارانہ نظر سے نہیں دیکھا تو دشمن ہمیں کچل کر رکھ دے گا اور امت کا تشخص فنا ہو جائے گا العیاذ باللہ العیاذ باللہ خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آئے۔

اب جب اللہ رب العزت نے ہمیں اتنا بڑا منصب عطا فرمایا ہے رباط کا حراست و پہرہ داری کا تو اس کی ذمہ داری ہمیں اچھے طریقہ سے اٹھانی چاہیے۔ اور اس کی مسئولیت پر پورا اترنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے لئے جہاں ہم شخصی طور پر محنت کریں کتاب پر، مضمون پر حاوی ہوں۔ بہتر سے بہتر اسلوب میں اس بات کو پیش کرنے کا سلیقہ پیدا کریں دل میں اتارنے کا اچھا عنوان اختیار کریں۔

وہاں رجوع إلی اللہ کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے

ہم اپنی دعاؤں میں اس بات کو بہت زیادہ نمایاں حیثیت دیں کہ جو لوگ ہم سے استفادہ کر رہے ہیں وہ ہماری وجہ سے کسی ابتلا کا شکار نہ ہوں۔ اور ہمیں بہتر انداز میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق میسر ہو۔

جب ہم درس گاہ میں جائیں تو جو ادعیہ ماثورہ ہیں وہ پڑھتے ہوئے جائیں۔

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری، اللھم الطف بی فی تیسیر کل عسیر

حسبنا اللہ ونعم الوکیل، وغیرہ یہ دعائیں پڑھتے ہوئے جائیں۔ ان ادعیہ ماثورہ کے بڑے اثرات ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ غزوات میں ایک طرف اگر مادی وسائل کے حصول کی کوشش کی گئی تو دوسری طرف سر بسجود ہو کر اللہ سے مانگا گیا۔ اس لئے ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ تیاری کی، دل جمعی اور یکسوئی پیدا کرنے کی بھی اور رجوع إلی اللہ کی بھی، اس لئے کہ یہ دین ہے اور دین، دین کے طریقے

سے، دین کے اسلوب سے، دین کی فکر سے، دین کے جذبے سے اختیار کیا جائے تو اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ان باتوں کا اگر ہم خیال رکھیں گے تو امید ہے کہ ہم اپنے کام، اپنی سعی اور اپنی جدوجہد کے اچھے ثمرات دیکھیں گے۔ اللہ کی ذات سے اس کی امید ہے اور اس طرح کی مجالس اسی مقصد کے استحضار کا مذاکرہ ہے۔جیسے میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ ان مجالس سے دو، دو چار کی طرح کوئی نسخہ مل جائے لیکن مجموعی طور پر اگر ایک فکر پیدا ہو تو یہ احساسِ فکر انشاء اللہ ہمارے طرزِ عمل کو بدل دے گا۔

آپ جتنی بھی کوشش کریں ساری ذمہ داری استاد کی طرف آتی ہے استاد سے کتاب حل ہوتی ہے۔ استاد سے مضمون ذہن نشین ہوتا ہے۔ استاد سے طالبعلم، طالبعلم بنتا ہے۔استاد سے طالبعلم با اخلاق بنتا ہے استاد سے اچھا ماحول پروان چڑھتا ہے۔استاد سے مدرسہ کی علمی فضاء بنتی ہے۔کوئی طالبعلم خود فرشتہ بن کر نہیں آتا۔وہ اپنے استاد کی شخصیت میں فرشتہ دریافت کر کے، اس کو نمونۂ عمل بناتا ہے۔

ساری ذمہ داری استاد پر ہے۔بس یہ احساس ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں یہ ایک انقلابی نقطہ ہوگا۔ یہ ایک ایسا موڑ ہوگا کہ ہمیں کچھ ہی دنوں میں تبدیلی نظر آنے لگے گی میرے پاس زیادہ کچھ نہیں ہے کہ عرض کروں لیکن اپنی اس تینتالیس سالہ تدریسی زندگی میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ

تدریس اور تربیت کا کام مکمل خود اعتمادی کے ساتھ ہونا چاہیے یکسوئی ہونی چاہیے فکرمندی ہونی چاہیے یہ بات اگر آ گئی تو راستہ کھل جائے گا اور اگر اس میں کمی ہے تو بہتر نتائج کی توقع خوش فہمی کی بات ہوگی۔

ہر چیز کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔اگر اس طریقہ کو اختیار کیا جائے تو نتیجہ کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن اگر اس طریقہ کو نظر انداز کیا جائے تو نتیجہ کی توقع کرنا خواب خیال کی بات ہے۔

میں پھر آپ سے معذرت کے طور پر کہتا ہوں کہ میں نے جو باتیں کہی ہیں ان کا سب سے پہلے مخاطب میں خود ہوں اس لئے کہ ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں۔جن اسباب کی ضرورت آپ کو ہے

اپنے کام کے عمدہ ثمرات کے لئے ان کی ضرورت مجھ جیسے کو بھی ہے۔ اور یہ مذاکرہ انشاء اللہ ہم سب کے لئے باعث خیر بنے گا اور اس کے مثبت نتائج اللہ نے چاہا تو ہم سب محسوس کریں گے۔ اللہ جل شانہٗ ہم سب کو ہمارے کاموں میں زیادہ سے زیادہ اخلاص کی بہتری اور حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری اس سعی کو اپنے فضل وکرم سے مشکور ومقبول بنائے۔

(آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۲ ارمئی ۲۰۱۰ء بروز بدھ بوقت صبح ۹:۰۰ بجے﴾

تدریسِ تفسیر...... کیسے؟

الحمد للّٰہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لانبی بعدہ، امابعد! فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. لقد منّ اللّٰہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکّیھم ویعلّمھم الکتٰب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلٰلٍ مبین. صدق اللہ العظیم

محترم حاضرین وسامعین! مدرسہ عثمانیہ کے منتظمین کے زیرِ اہتمام مدارس کے معلّمین ومعلّمات کو طرقِ تدریس سکھانے کے لئے جو دو (۲) روزہ کورس "تدریب المعلمین" کے نام سے شروع کیا گیا ہے، اس میں میرا موضوع "تدریسِ تفسیر" ہے۔

عظمتِ قرآن:

قرآنِ کریم وہ نسخۂ کیمیا ہے جس کی بابت ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَوْ أَنزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهٗ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

سورۃ الحاقۃ میں اس صحیفۂ ہدایت کی عظمت کے بیان کا یہ منفرد انداز ملاحظہ فرمایئے:

فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ،وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ،إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ، وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلاً مَّا تُؤْمِنُوْنَ

"اے انسانو! تمہاری بصارت کی زد میں آنے والی چیزوں کی قسم! اور تمہاری بصارت کے دائرۂ حدود سے ماوراء اشیاء کی قسم! یہ کلام معزز ومحتشم رسول کا ہے کسی شاعر کا نہیں۔"

قرآن کا عام انداز یہ ہے کہ یہ کسی چیز کی عظمت کے اظہار کے لئے قسم اٹھاتا ہے تو مقسم بہ کو متعین کرتا ہے مثلاً:

لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ...... لَاۤ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ...... وَالتِّيْنِ...... وَالزَّيْتُوْنِ...... وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ......!

لیکن یہاں اس عام قانون کے برعکس صرف یہ ارشاد فرمادیا کہ مجھے مبصرات و مغیبات ہر ایک کی قسم...... یوں کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اس قسم میں شامل ہوگئی، کیا دریا کیا سمندر...... کیا آسمان کیا زمین...... کیا سیارے کیا ستارے...... کیا سورج کیا چاند...... کیا نباتات کیا جمادات...... کیا ہوا اور کیا فضا......!

سورۂ واقعہ میں ایک اور حلفیہ انداز کچھ یوں مذکور ہے:

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ. وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ.

''ستاروں کے گرنے کی قسم! اور یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم سمجھو، بیشک یہ قرآن بڑی عزت والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے۔''

ان آیات کو تلاوت کرنے کا مقصد قرآن کی عظمت کو اُجاگر کرنا ہے، یاد رکھئے کہ فہم قرآن کے لئے معلّم و متعلّم دونوں کے دل میں اس عظیم کتاب کی عظمت کا ہونا ضروری ہے۔

فہمِ قرآن کی ضرورت:

میرے ہم مشرب بھائیو! یوں تو قرآن کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق سعادت سے خالی نہیں، اسے چھونا اسے چھاپنا...... اسے چومنا اسے دیکھنا...... اس کی تعلیم اس کا تعلّم...... اس کا حفظ اس کا ناظرہ...... ان میں سے کون سا تعلق ہے جو دارین کی فلاح کا ضامن نہیں؟ لیکن میرے بھائیو! فہم قرآن اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا جواب نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تمام مادّی نعمتوں کے بارے میں فرمایا:

قل متاع الدنیا قلیل ''دنیا کا ساز وسامان قلیل ہے''

لیکن سورۂ بقرۃ میں ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

''جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کی گئی''

اور ''حکمت'' کی تفسیر رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ''فہم قرآن'' سے کی ہے، گویا اللہ نے ''فہم قرآن'' کو ''خیر کثیر'' سے تعبیر فرمایا۔

شاہ ولی اللہ کے خاندان کی خدمتِ قرآن:

درسِ قرآن، تدریسِ قرآن اور فہمِ قرآن کتنی بڑی نعمت ہے؟ میں اس کے لئے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے چند جملے آپ کو سنانا چاہتا ہوں مگر پہلے یہ جان لیجئے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آپ جیسی جامع شخصیت نے جنم نہیں لیا...... اور میں یہ بات تو وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت خاندان حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے بڑھ کر کسی کے حصے میں خدمتِ قرآن نہیں آئی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا شاہ وجیہ الدین دورانِ تلاوت شہید ہوئے، آپ کے والد شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی قرآن کی خدمت میں گزری، خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قرآن کے مفسّر اور معلّم رہے، اور پھر اس نعمتِ عظمیٰ کا سلسلہ آپ سے آپ کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں منتقل ہوا...... شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر شاہ عبدالغنی اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ...... ان میں سے کوئی نام ایسا نہیں جو خدمتِ قرآن کے سلسلے میں تعارف کا محتاج ہو، یوں کہہ لیجئے کہ یہ خاندان ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق تھا۔

اپنی مشہورِ عالم کتاب'' الفوز الکبیر '' کے خطبہ کی ابتداء حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ سے کی:

''آلاء اللّٰہ علی هذا العبد الضعيف لاتُعَدُّ ولاتحصى واجلّها توفيق لفهم القرآن''

''اس ضعیف بندہ پر یوں تو اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں مگر ان میں سے سب سے بڑی نعمت

فہم قرآن ہے"۔

آگے فرماتے ہیں:

"ومن صاحب النبوة والرسالة عليه الصلوٰة والسلام على احقر الأمة كثيرة واعظمها تبليغ الفرقان الكريم"

"صاحب نبوت ورسالت ﷺ کے احسانات امت کے اس حقیر فرد پر کثیر ہیں اور سب سے بڑا احسان ہم تک قرآن پہنچانا ہے"۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ساٹھ سال تک دہلی میں درسِ قرآن دیا، شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مفتی اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک اکبری مسجد میں اعتکاف فرما کر ترجمہ قرآن لکھا۔

اور میری نظر سے یہ بات گزری کہ اس مسجد کا ایک حصہ متعین تھا جہاں آپ تشریف فرما ہوتے تھے، چالیس سال تک مسلسل بیٹھنے سے وہاں نشان پڑ گئے...... اللہ تعالیٰ نے کشف کی دولت سے بھی نواز رکھا تھا، کتابوں میں لکھا ہے کہ رمضان کا مہینہ شروع ہوتا تو لوگ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل دیکھتے، اگر وہ پہلی تراویح میں دو پارے تلاوت فرماتے تو لوگ سمجھ لیتے کہ اس مرتبہ رمضان ۲۹ کا ہوگا اور اگر ایک پارہ کی تلاوت ہوتی تو سمجھ لیا جاتا کہ رمضان ۳۰ کا ہوگا۔

دلوں میں عظمتِ قرآن کا فقدان:

میں نے اپنی گفتگو کا آغاز عظمتِ قرآن سے کیا تھا، یہاں عرض کرتا چلوں کہ اس عظیم کتاب کی قدر ومنزلت اس طرح نہیں کی جارہی جس کی یہ حقدار ہے، صرف ونحو، فقہ واصولِ فقہ کو پڑھا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے، ان میں کمال کی کوشش کی جاتی ہے اور بڑا عالم بھی اسے ہی سمجھا جاتا ہے جو فنون میں ماہر ہو، لیکن قرآنِ کریم کے ساتھ ہمارا معاملہ بڑا افسوس ناک ہے، نہ اسے سمجھنے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے اور نہ اس میں کمال کا کوئی داعیہ ہمارے دلوں میں موجزن ہوتا ہے، دوسری طرف قرآن کی تدریس سے منسلک افراد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو وقت گزاری کر رہے ہیں۔ کمال کا مدرّس تو وہ ہے جو فقہ واصول فقہ وغیرہ پڑھاتا ہے...... یہ سوچ اس بات کی غماز ہے کہ ہمارے دلوں میں قرآن کی عظمت

باقی نہیں رہی، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کے لگ بھگ کی بات ہے کہ بعض غیر مسلموں کا مسلمان علماء کے ساتھ مناظرہ ہوا، اس وقت تک لاطینی زبان میں قرآن کا ترجمہ ہو چکا تھا اس لئے غیر مسلم بھی قرآن سے واقف تھے، چنانچہ وہ بعض مواقع پر قرآن سے حوالہ پیش کرتے تو مسلم علماء اس کا انکار کر دیتے کہ قرآن میں تو یہ بات موجود نہیں ہے، اور جب قرآن دیکھا جاتا تو وہ بات قرآن میں موجود ہوتی...... آپ اندازہ کیجئے کہ غیر مسلم تو قرآن سے حوالے پیش کریں اور مسلمانوں کو اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ یہ مسئلہ قرآن میں موجود ہے یا نہیں...... اسے عظمتِ قرآن سے ناواقفیت اور فہم قرآن سے اعراض کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

تقدس بدون تدبر:

آج ہماری صورتحال یہ ہے کہ قرآن کے مقصدِ اصلی کو تو پسِ پشت ڈال دیا، اس سے ہدایت کا حصول تو ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہی ہو گیا...... ہاں! البتہ محض خالی خولی تقدس ہے، جسے ہم نے قرآن کے تمام حقوق کا بدل قرار دے دیا ہے، قرآن کو بڑی محبت سے بوسہ دے دیتے ہیں...... غلاف بڑا خوبصورت اور قیمتی چڑھا لیتے ہیں...... الماری میں بند کر کے رکھ دیتے ہیں...... اونچی جگہ پر رکھنا بھی لازم سمجھتے ہیں، لیکن فہم...... تدبر...... عمل......! ان بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔

بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ میوات تشریف لائے تو میواتیوں سے پوچھا، مسلمان ہو؟ کہنے لگے جی ہاں! اور جب نام پوچھے تو یا تو مکمل ہندوانہ نام یا آدھا نام مسلمانوں والا اور آدھا ہندوؤں والا! پھر حضرت نے سوال کیا کہ نماز پڑھتے ہو؟ جواب ملا نہیں، کلمہ آتا ہے؟ نہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہو؟ نہیں، قرآن دیکھا ہے؟ بولے، جی ہاں! ہمارے گھروں میں قرآن کے نسخے رکھے ہوئے ہیں، فرمایا جاؤ، لے آؤ...... اور جب قرآن لے کر آئے تو گوبر میں لپٹا ہوا...... پوچھا گیا قرآن پر گوبر لیپنے کا مطلب؟ جواب دیا گیا کہ تقدس کی وجہ سے! (لاحول ولا قوۃ)...........

ہندوؤں کے ساتھ بود و باش کی وجہ سے ان کے دل و دماغ میں بھی گوبر کا تقدس بیٹھ گیا تھا اور انہوں نے اپنے خیال میں مقدس کلام کو مقدس چیز سے لیپ کر اس کے تقدس اور احترام کا حق ادا کر دیا تھا۔ عوام میں یہ روش عام ہے کہ ظاہری ادب تو کرتے ہیں مگر حقوق ادا نہیں کرتے۔

پنجاب میں ہمارے علاقے کے قریب کچھ لوگ رہتے ہیں جنہیں ان کی مخصوص بودوباش اور بولی ٹھولی کی وجہ سے جانگلی کہا جاتا ہے، ہم نے دیکھا کہ مسجد کے قریب سے گزریں گے تو دیواروں کو ہاتھ لگا کر ہاتھ چوم لیں گے، لیکن نماز کی توفیق انہیں نہیں ہوتی...... حضور ﷺ کا نام آئے گا تو انگوٹھے چومیں گے لیکن اطاعت کے لئے تیار نہیں ہوں گے...... عمل سے دوری اور تقدس محض نے آج ہمیں بالکل بودا اور کھوکھلا کردیا ہے، اقبال مرحوم کے یہ اشعار کتنے مناسب وقت پر میری لوحِ ذہن پر ابھرے ہیں:

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیرِ فیصل کو سنّوسی نے پیغام دیا
تو نام ونسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہوجاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اور ضربِ کلیم میں احتجاج کا یہ انداز اختیار کرتے ہیں:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تیری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تیری اذاں میں نہیں ہے میری سحر کا پیغام

احساسِ کمتری...... کیوں؟

اللہ اکبر! قرآن کے حوالے سے جب بھی گفتگو ہوتی ہے تو اپنے رویّوں پر سخت افسوس ہوتا ہے...... ہم عینی شاہد ہیں کہ جو استاد کسی کتاب کے سبق کا اہل نہیں، اسے ترجمہ وتفسیر پر لگا دیا جاتا ہے۔

اجلاس ہوتا ہے اسباق کی تقسیم کے حوالے سے، ہر استاد کی قابلیت زیر بحث آتی ہے، فلاں استاد بہت ذہین ہے، قطبی اسے دے دی جائے...... فلاں استاد بڑا باصلاحیت ہے، سلّم اس کے حوالے کر دی جائے...... فلاں کو تدریس کا بڑا ملکہ ہے، بس سوچنے والی کیا بات ہے؟ میبذی اسی کا حق ہے، اور ہاں! ہدایہ اور شرح تہذیب فلاں استاذ کے سپرد ہیں، طلباء ان کے سبق سے بہت مطمئن ہوتے ہیں...... آخر میں اس استاذ کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے جس کا رزلٹ کبھی اچھا نہیں آتا تھا، استعداد بھی بہت کمزور ہے، لیکن اب مدرسہ میں آہی گیا ہے تو منتظمین فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کے لئے ''ترجمہ تفسیر'' بہت موزوں رہے گا۔

ایسے واقعات بھی ہمارے مشاہدہ میں آئے کہ استاذ ''تفسیر عثمانی'' سامنے رکھ کر طلباء کو ترجمہ وتفسیر پڑھا رہا ہے...... اور یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ قرآن مجید کی تعلیم وتعلّم سے وابستہ بعض افراد بھی شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں...... ایسے ہی ایک قاری صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ مدرسہ میں کیا پڑھاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ''میں بیضاوی شریف کا متن پڑھاتا ہوں''۔

انہیں خیال ہوا کہ اگر میں نے یہ کہہ دیا کہ میں بچوں کو حفظ کرواتا ہوں یا ناظرہ پڑھاتا ہوں تو مخاطب کے ذہن میں میرا کوئی مقام نہیں رہے گا، دنیا کی سب سے عظیم اور عالمگیر کتاب کا مدرّس اس احساسِ کمتری میں کیوں مبتلا ہے؟ ہم اس سوال کا جواب اس کے علاوہ اور کیا دے سکتے ہیں کہ ہم قرآن کے حقیقی مقام ومرتبہ کا ادراک ہی نہ کر سکے۔

آپ چونکہ ''معلمین ومعلمات'' ہیں اس لئے میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر آپ کو کسی مدرسہ کی نظامت ملے تو تفسیر کے لئے محنتی اور قابل استاذ کا انتخاب کریں۔

ایک حقیقت:

درسِ قرآن کے حلقوں کا آغاز جب ان لوگوں نے کیا جو ڈاکٹرز، پروفیسرز اور انجینئرز تھے، تو ہم نے ان کا مذاق اڑایا کہ لو جی! اردو کی چند تفسیریں دیکھ کر آگئے ہیں درسِ قرآن دینے! لیکن افسوس کہ ان کا مذاق اڑاتے اڑاتے ہم خود مذاق بن گئے اور ان لوگوں نے اپنی کمزوریوں کو بھانپ کر اپنی اصلاح کر لی، چنانچہ اب یہ لوگ صرف ونحو میں مہارت حاصل کرتے ہیں، قدیم جاہلی ادب کا مطالعہ

کرتے ہیں، بعض مدارس کے قابل ترین اساتذہ کو اپنا استاذ منتخب کر کے ان سے استفادہ کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں اسی طرح پڑھائیں جس طرح آپ اپنے مدارس میں اپنے طلباء کو پڑھاتے ہیں، تدریس کا جو مشکل ترین طریقہ ہے ہمارے لئے وہ منتخب کریں۔

مجھے بعض مدرسین نے خود بتایا کہ فلاں تنظیم والوں نے مختلف مدارس کے اساتذہ کے انٹرویوز لئے، انہیں جانچا، پرکھا، اور بالآخر سب سے ذہین استاذ کو تدریسِ تفسیر کا فریضہ سونپا...... اور معاف کیجئے گا ہمارا حال کیا ہے؟ ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' ہر شخص علامہ ہونے کا دعویدار ہے، اپنی اصلاح کے لئے تنقید ومحاسبہ تو ہماری فطرت سے گویا اٹھ ہی گیا، اور علمی انحطاط کا یہ عالم ہے کہ ''تفسیر عثمانی'' اور ''معارف القرآن'' کے علاوہ تیسری کسی تفسیر کی طرف رجوع کی توفیق ہی نہیں ملتی...... بات سخت ہے مگر سچ ہے...... ہم اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتے۔

استفادہ کی نیت سے مطالعہ وتدریس کریں:

محترم معلمین ومعلمات! اللہ نے آپ کو جو منصب عطا کیا ہے یہ بہت عظیم منصب ہے، آپ علم وحکمت کے موتی بانٹنے والے لوگ ہیں، لوگ اپنی علمی تشنگی آپ کے دروس سے دور کرتے ہیں، ایک گزارش میں آپ سے کرنا چاہوں گا کہ افادہ سے زیادہ استفادہ کی نیت سے مطالعہ کیا کریں۔

پھر یہ کہ درس کے لئے کون کونسی تفسیر کو دیکھا جائے تو تفاسیر کا ذخیرہ الحمدللہ! بہت زیادہ ہے، اردو تفاسیر بھی ہیں اور عربی بھی!

معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، معارف القرآن، حضرت کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، تفسیر مظہری، تفسیر عثمانی اردو تفاسیر میں بڑا بلند مقام رکھتی ہیں۔

ایک اور تفسیر جس کا مشورہ میں عموماً ساتھیوں کو دیتا رہتا ہوں، وہ ''تفسیر ماجدی'' ہے۔ یہ تفسیر مولانا عبد الماجد دریابادی کی ہے جنہیں جدید علوم پر گہری دسترس حاصل تھی، جدید نظریات اور ادیانِ باطلہ ان کا خاص موضوع ہے، اپنی تفسیر میں بائبل کے حوالے مولانا نے کثرت سے دئے ہیں، اور قرآن کے ساتھ تقابل کر کے بائبل کے سقم اور تحریفات کو خوب ثابت کیا ہے، اس تفسیر کی تصنیف کے وقت دریابادی صاحب نے قدم قدم پر حضرت حکیم الامت سے مشورے لئے، خود لکھتے ہیں کہ:

جب میں تفسیر لکھ رہا تھا تو میرا معمول تھا کہ وضو کر کے نفل پڑھتا اور پھر دعا کرتا اور دعا میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واسطہ دے کر اللہ سے التجا کرتا:

''یا اللہ جیسے آپ نے ان کا سینہ کھول دیا تھا، میرا سینہ بھی کھول دیجئے۔''

آپ ان کی تفسیر کا مطالعہ کریں گے تو یہ جملہ ضرور دیکھیں گے '' مرشد تھانوی نے یوں فرمایا''۔ اس سے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

مولانا دریابادی صاحب کے کچھ تفردات بھی ہیں اور شہیدِ اسلام حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسی زیرک اور دور اندیش شخصیت نے ان پر تنقید بھی کی ہے، لیکن جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے تو اس میں دریابادی صاحب نے تفردات سے احتراز کیا ہے۔

عربی تفاسیر:

اردو تفاسیر کے بعد عربی تفاسیر کے حوالے سے میں اپنے اکابر میں سے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی رائے آپ کے سامنے رکھتا ہوں:

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے '' روح المعانی...... تفسیر کبیر...... ابن کثیر...... اور تفسیر ابی سعود'' کے بارے میں فرمایا کہ ان چاروں کا مطالعہ دیگر تفاسیر کی طرف مراجعت سے مستغنی کر دیتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام صاحب نے ان چار تفاسیر کے علاوہ ''قرطبی'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ البتہ یہ بات بھی شک وتردد سے بالاتر ہے کہ ''تفسیر'' جیسے موضوع سے متعلق ہم کسی ایک یا چند تفاسیر کو حرفِ آخر نہیں کہہ سکتے۔

بعض حضرات نے اس بارے میں بڑی کوشش کی کہ ہماری تفسیر متقدمین کے ذکر کردہ تمام پہلوؤں کو محیط ہو، مفردات پر بحث ہو، صرف ونحو کی باریکیاں ہوں...... معانی وبدیع کے دقائق ہوں...... فصاحت وبلاغت کی نکتہ آفرینیاں ہوں...... فقہ کے مسائل ہوں...... تصوف کی باتیں ہوں، لیکن اپنی سی کوشش کے باوجود کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ میں نے تفسیر کا حق ادا کر دیا ہے، اور اس تفسیر کے بعد اب کسی دوسری تفسیر کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

عربی تفاسیر سے استفادہ...... کیسے؟

آج کے دور کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مواد کے ہوتے ہوئے بھی ہم اس سے مستفید نہیں ہو سکتے، اور استعداد کی کمزوری، ناقص اور زنگ آلود صلاحیتیں، ضعفِ حافظہ کی عمومی وباء، اور اوقات میں بے برکتی اس کی بنیادی وجوہات ہیں۔

میں اپنے ناقص تجربے کی بناء پر ساتھیوں کو مشورہ دیتا رہتا ہوں کہ "ایسر التفاسیر، تفسیر منیر اور صفوۃ التفاسیر" ان تین جدید عربی تفاسیر کا مطالعہ اپنے اوپر لازم کر لیں، یہ انتہائی سہل اور سادہ انداز میں لکھی گئی تفاسیر ہیں، ان کا مستقل مزاجی سے مطالعہ دیگر قدیم عربی تفاسیر تک آپ کی رسائی ممکن بنا سکتا ہے۔

ایسر التفاسیر علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی تالیف ہے اور تفسیر منیر کے مؤلف وہبۃ الزحیلی ہیں، ان کے بعض تفردات بھی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تفسیر میں انہوں نے اسلاف کی رائے سے کہیں انحراف نہیں کیا، اس کے باوجود اگر کوئی بات ایسی ہو جو مسلکِ جمہور سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو صاحب علم ہونے کی حیثیت سے آپ اس سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ صفوۃ التفاسیر علامہ صابونی کی تفسیر ہے، ان کے قلم میں بڑی روانی ہے اور یہ اب تک کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔

اور ہاں! یاد آیا، علامہ جمال الدین قاسمی کی "تفسیر القاسمی" بھی بڑی عمدہ ہے، مجھے خود یہ تفسیر بڑی پسند ہے، ان کی تفسیر کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بڑے صاحب درد اور امت کے لئے کڑھنے والے انسان تھے اور عظمتِ قرآن دلوں میں جاگزیں کرنے کے شدت سے آرزومند تھے۔

اور دوستو! مطالعہ کو منضبط انداز میں پیش کرنا بھی بہت ضروری ہے، اگر مطالعہ تو بہت زیادہ ہو لیکن بات میں انضباط کی حدود وقیود کی رعایت نہ ہو تو طالبعلم اکتاتے بھی ہیں، ذہنی طور پر پریشان بھی ہوتے ہیں اور ایسے درس سے متاثر بھی نہیں ہوتے۔

اس لئے گزارش یہ ہے کہ مطالعہ کے وقت نوٹ بک ساتھ رکھیں، اہم نکات ترتیب وار لکھ لیں اور پھر درس دیں۔

متنِ قرآن پر بھی توجہ دیں:

یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ ہمیں تفسیری اقوال تو ازبر ہوتے ہیں لیکن ترجمہ نہیں آتا، میں نے دورانِ تدریس بعض اوقات دورۂ حدیث کے طلباء سے پوچھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کس کس کو آتا ہے؟ تو یقین کیجئے کہ بھری کلاس میں چند ہاتھ ہی بلند ہوئے۔

آپ اگر اپنے گردوپیش پر نظر ڈالیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہم نے قرآن کریم کے الفاظ کو تو اہمیت دی اور دینی بھی چاہیے! لیکن معانی میں تدبر کی طرف کم توجہ کی گئی۔

ایسے ایسے حفاظ کرام دیکھے جنہیں حفظ میں بڑی مہارت ہے، آپ کے اس کراچی میں بھی ایسے حافظ بچے موجود ہیں جو حفظ میں حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں، مجھے امریکہ سے بعض ساتھیوں نے بتایا کہ وہاں ایسے بچے موجود ہیں جو پاکستانی حفاظ سے زیادہ مہارت کا ثبوت دے سکتے ہیں، اسی طرح گوجرانوالہ کے ایک تاجر نے ٹیلیفون کیا کہ میرا حفظ کا مدرسہ ہے اور اس میں ایسے بچے ہیں جو کراچی کے بچوں سے بہت آگے ہیں...... عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے الفاظ کو تو خوب اہمیت دی لیکن یہ فراموش کر بیٹھے کہ فہم قرآن بھی اللہ کا حکم ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے تدبرِ قرآن کو نزولِ قرآن کا مقصد قرار دیا ہے۔

☆...... كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوْا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ اُوْلُو الْاَلْبَابِ.

☆...... اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا.

اور سورۂ فرقان میں رسول اللہ ﷺ کا شکوہ مذکور ہے:

" وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَارَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوْرًا"

ایک قول کے مطابق یہاں "ہجرانِ قرآن" سے مراد "فہم قرآن" سے اعراض ہے۔

تو یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ طلباء کو مفرداتِ قرآن سے واقفیت ہو...... میں اس کا طریقہ مختصراً عرض کیے دیتا ہوں:

آپ سورۂ فاتحہ سے آغاز کرتے ہیں تو سب سے پہلے لفظ "الحمد" آتا ہے، چونکہ آپ سے پڑھنے والے عام لوگ نہیں بلکہ طلباء دین ہیں لہٰذا آپ ذرا گہرائی سے ہر لفظ کو لیں...... الحمد میں حمد کی

تعریف کریں..... حمد اور مدح میں فرق پوچھیں، مادۂ حمد قرآن مجید میں کہاں کہاں اور کس کس انداز میں آیا ہے؟ اس بارے میں طلباء سے تحقیق کروائیں۔

اس کے بعد اسی انداز سے لفظ ''اللہ'' ''رب'' ''عالمین'' وغیرہ ایک ایک لفظ پر تحقیق کریں تا کہ طلباء میں تحقیق وجستجو کا جذبہ پیدا ہو۔ اس اندازِ تدریس میں امام راغب اصفہانی کی ''مفردات القرآن'' ایک بہترین راہنما کا کام دے سکتی ہے، اس کے علاوہ لغت کی دیگر کتب بھی مطالعہ میں رکھیں۔

جامعہ بنوریہ کے زمانۂ تدریس کے دوران ''لیبر اسکوائر'' جیسے پسماندہ علاقہ میں میں نے ترجمۂ قرآن پڑھانے کا آغاز کیا، میرے پاس ترجمہ پڑھنے والے عام لوگ تھے، کالج کے طلباء اور فیکٹریوں کے ملازم وغیرہ! میں نے تدریس کا یہی طریقہ اختیار کیا کہ انہیں ایک ایک لفظ کا ترجمہ یاد کروایا، اور الحمدللہ! تھوڑی سی محنت کے بعد وہ بڑی روانی کے ساتھ مفردات کا ترجمہ کرنے کے قابل ہو گئے۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کے اکثر مفردات آپس میں ملتے جلتے ہیں، اگر چند پارے توجہ سے پڑھا دیئے جائیں تو نوے فیصد مفردات طلباء کی سمجھ میں آجائیں گے۔

مفردات کے بعد جب تفسیر کا مرحلہ آئے تو تفسیر القرآن بالقرآن کو مقدم رکھیں، اس کے بعد تفسیر بالمأثور اور لغت وغیرہ کا درجہ ہے۔

طلباء میں وسعت نظری پیدا کرنے کے لئے متعارض آیات کے حل پر بھی خوب توجہ دیں مثلاً:

قرآن ابتداء میں اعلان کرتا ہے..... ذلك الكتاب لاريب فيه.....اور آگے ارشاد ہوتا ہے.....وان كنتم في ريب مما نزلنا علىٰ عبدنا ..... جواب اس کا یقیناً آپ کو معلوم ہوگا، لیکن پھر بھی عرض کرتا چلوں کہ ابتداء میں قرآن کے محلِ شک ہونے کی نفی ہے اور آگے جو اس میں وجودِ شک مستفاد ہوتا ہے تو وہ نتیجہ ہے مشرکین ومعاندین کی جہالت وغباوت اور کج فکری کا! متعارض آیات کے حل کے لئے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مشکلات القرآن'' دیکھی جاسکتی ہے، اس کتاب میں حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے افادات موجود ہیں۔

حلِ تعارض کے علاوہ الفاظِ مترادفہ میں فرق بتانے سے درس کی اہمیت وافادیت اور طلباء کا ذوق بڑھتا ہے، مثلاً ریب، شک..... تاویل، تحریف..... تمام، کمال..... جمال، زینت..... جہاد، قتال ..... حرص، طمع وغیرہ۔

الفاظ مترادفہ کے فروق پر مارکیٹ میں کئی کتب دستیاب ہیں۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال:

آج جدید ٹیکنالوجی کی بدولت مطالعہ اور مواد کی دستیابی میں بڑی آسانی پیدا ہوگئی ہے، میں خود کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ کے استعمال سے ناواقف ہوں لیکن ان کی اہمیت کا بہت قائل ہوں، ایک دفعہ ایک ساتھی مجھے کہنے لگے کہ آپ کوئی لفظ بتائیں میں آپ کو اس کی تفسیر کے لیے سو (۱۰۰) حوالے پیش کردوں گا، میں نے لفظ ''طاغوت'' کی تفسیر چاہی...... انہوں نے چند منٹ میں میرے سامنے ایک سو تفاسیر کھول کر رکھ دیں۔

سو (۱۰۰) تفاسیر کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات کے علاوہ ان کی ورق گردانی کے لئے میرے خیال میں ہفتوں درکار ہوں گے لیکن اب یہ کام صرف چند منٹ میں ہوسکتا ہے، اس لئے جدید ذرائع کو بھی ضرور استعمال میں لائیں۔

قرآنی تکرار کے فوائد:

ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے مضامین میں تکرار بہت زیادہ ہے اگر آپ اس تکرار کے فوائد اور حکمتوں کو زیر بحث لائیں تو قرآن کی عظمت کا نقش مزید گہرا ہوگا۔ وقت کی قلت کی بناء پر میں سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں پایا جانے والا ایک تکرار اور اس کے فوائد آپ کی نذر کرتا ہوں:

سورۂ اعراف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

واذقیل لھم اسکنوا ھٰذہ القریۃ

اور سورۂ بقرہ میں ہے:

واذقلنا ادخلوا ھٰذہ القریۃ

ان دونوں آیات کا مضمون بھی ایک ہے اور واقعہ بھی ایک ہے، لیکن ان میں آٹھ اعتبار سے فرق ہے۔

(۱) سورۂ بقرہ میں ''ادخلو'' ہے اور سورہ اعراف میں ''اسکنوا'' ہے اور سکونت لازم ہے دخول کو، تو ایک جگہ لازم کا ذکر ہے اور دوسری جگہ ملزوم کا۔

(۲) سورۂ اعراف میں ہے ''اسکنوا...... وکلو...... واؤ جمعیت کا فائدہ دیتی ہے، تو گویا اکل

وسکونت کو جمع کر دیا اور سورۂ بقرہ میں ''ادخلو......فکلو'' ہے اور فا تعقیب اور بعدیت کے لئے آتی ہے لہٰذا مطلب یہ بنا کہ پہلے ''دخول'' ہوگا بعد میں ''اکل'' ہوگا۔

(۳) سورۂ بقرہ میں ''ادخلو'' کے بعد ''رغدا'' بھی ہے اس لئے کہ سفر کے بعد آدمی کسی بستی میں داخل ہو تو بھوک زیادہ ہوتی ہے اور کھانے میں لذت بھی خوب آتی ہے، لیکن اعراف میں ''اسکنوا'' کے بعد یہ اضافہ حذف ہے، اس لئے کہ حالتِ سکونت میں بھوک کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو حالتِ سفر میں ہوتی ہے۔

(۴) سورۂ اعراف میں ''حطۃ'' مقدم اور سورہ بقرہ میں مؤخر ہے، گویا ہر حال میں استغفار کی ترغیب ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

(۵) سورۂ اعراف میں ''خطیئتکم'' اور بقرہ میں ''خطایاکم'' کا صیغہ استعمال ہوا ہے، یعنی اللہ سے صغیرہ کبیرہ، قلیل و کثیر تمام گناہوں کی معافی کی درخواست کرو۔

(۶) سورۂ بقرہ میں ''سنزید'' کے ساتھ واؤ کا اضافہ ہے اور سورۂ اعراف میں نہیں ہے، واؤ کے ترک سے ''استیناف'' حاصل ہو گیا اور معنی یہ ہوا کہ اللہ دو چیزوں کا وعدہ کرتا ہے، مغفرت کا بھی اور عطائے مزید کا بھی!

(۷) سورۂ بقرہ میں ''فانزلنا'' ہے اور انزال سے کثرت کا معنی حاصل ہوتا ہے، دوسری طرف اعراف میں ''فارسلنا'' ہے اور ارسال قلت کو بتاتا ہے...... انداز بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ پہلے عذاب ہلکا تھا لیکن جب باز نہ آئے تو زیادہ کر دیا گیا۔

(۸) سورۂ بقرہ میں ''یفسقون'' اور سورہ اعراف میں ''یظلمون'' ارشاد فرمایا، معلوم ہوا کہ وہ جتلائے عذاب ہوئے تو اس لئے کہ ان میں فسق و ظلم دونوں گناہ پائے جاتے تھے۔

تدریسِ تفسیر اور جدید سائنسی تحقیقات:

قرآن کا مقصدِ اولین انسانوں کی ہدایت ہے، نہ یہ میڈیکل اور سائنس کی کتاب ہے اور نہ اپنے نظریات کی تصدیق کے لئے جدید ریسرچ کی محتاج ہے، لہٰذا کمزور باتیں اور ایسی تحقیقات جن کے لئے دور دراز کی تاویلیں کرنی پڑیں، انہیں قطعاً قطعاً اپنے درس کا حصہ نہ بنائیں...... ہاں! بعض طبائع اس

اندازِ بیان سے متاثر ہوتی ہیں اوران کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے،توان کے لئے مسلّم تحقیقات بیان کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں،لیکن طرزِ بیان سے سائنس کوقرآن کا تابع ثابت کیجئے متبوع بنانے سے اجتناب کریں۔

جدید مسلّم تحقیقات میں سے چند مثالیں ذکر کرتا چلوں:

ارشادِ ربانی ہے:

"فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً."

"آج ہم تیرے بدن کونجات دیں گےاور بعدوالوں کے لئے اسے عبرت بنادیں گے۔"

آج سے سواسو سال پہلے تک فرعون کی لاش کا کہیں نام ونشان نہ تھا،چنانچہ آپ قدیم تفاسیر اٹھاکردیکھیں تومفسرین نے مختلف تاویلیں کی ہیں۔

کسی نے کہا کہ اللہ نے ایک مہینہ یاایک سال تک اس کی لاش کوسلامت رکھا،لہٰذا اتنا عرصہ تک وہ لوگوں کے لئے نشانِ عبرت بنی رہی اور پھرختم ہوگئی،کسی نے کہا کہ بدن کا اطلاق "زِرہ" پربھی ہوتا ہےاوراس کی زِرہ محفوظ تھی......لیکن سواسوسال پہلے عیسائی ماہرین آثارِقدیمہ نے اُہرامِ مصر کی کھدائی کا کام شروع کیاتومختلف صندوق پڑے ہوئے ملے جن میں حنوط شدہ لاشیں تھیں،ان میں سے ایک صندوق میں فرعون کی لاش بھی تھی،اورجب اس کے زمانہ کااندازہ لگایا گیاتوثابت ہواکہ یہ وہی فرعون ہے جوسیّدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آپ کے خلاف برسرِ پیکاررہا۔

اس تحقیق سے قرآن کی پیشن گوئی "فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ" درست ثابت ہوگئی۔

سورۂ ذاریات میں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ

"ہم نے ہرچیز کوجوڑاجوڑا بنایاہے"

کچھ عرصہ قبل تک یہی نظریہ رائج تھا کہ جوڑاجوڑاصرف انسانوں میں ہوتا ہے،لیکن آج جدید تحقیقات کے ذریعے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ انسانوں کے علاوہ درخت،پتھراوردیگراشیاء بھی جوڑاجوڑاہیں،کائنات کاسب سے چھوٹا ذرّہ ایٹم ہےاوروہ بھی پروٹان اورنیوٹران کی صورت میں جوڑاجوڑاہے۔

قرآن نے انسان کی تخلیق کے مراحل کی یہ ترتیب بیان فرمائی:

"ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً"

اور آج جدید آلات سے رحم مادر کا مشاہدہ کرنے کے بعد سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تخلیق کے جو مراحل قرآن نے بیان کیے ہیں، ان میں اوّل تا آخر صداقت ہی صداقت ہے۔

اس قسم کی مسلّمہ تحقیقات ضرور بیان کی جائیں...... لیکن آج جو یہ رواج چل پڑا ہے کہ تحقیق بعد میں آتی ہے اور اس کا تعلق قرآن سے پہلے ہی جوڑ دیا جاتا ہے، یہ بالکل غلط ہے۔

تقابلِ ادیان کو بھی موضوعِ درس بنائیں:

درسِ تفسیر کا ایک لازمی جز تقابلِ کتب بھی ہے، یعنی قرآن کسی مضمون کو کس پیرائے میں بیان کرتا ہے اور تورات وانجیل میں اس مضمون کو کیسے بیان کیا گیا ہے۔

دیگر آسمانی کتابوں اور ادیان کے ساتھ تقابل سے قوتِ ایمانیہ میں زبردست اضافہ ہوتا ہے اور دینِ اسلام کی صداقت ومحبت کے جذبات دل میں مچلنے لگتے ہیں۔

ایک مثال اس کی بھی ملاحظہ فرمالیں:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام میں مختلف انبیاء کا ذکر فرمایا:

"وزکریّا ویحییٰ وعیسیٰ والیاس"

اور پھر آگے ارشاد فرمایا:

"کلٌّ من الصّالحین" یہ سب کے سب نیکوکار تھے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی نبی کے صالح ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ اللہ کا ہر نبی تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتا ہے، پھر "کلٌّ من الصّالحین" کا ذکر کرنا، کیا معنیٰ؟

اس جملہ کے اضافے کی حکمت اور اہمیت کا اندازہ تب ہوا جب بائبل اٹھا کر دیکھی، بائبل کہتی ہے کہ معاذ اللہ اللہ کا نبی کاہن ہوسکتا ہے، جادوگر ہوسکتا ہے، شرابی ہوسکتا ہے، زانی ہوسکتا ہے، حتی کہ بت پرست بھی ہوسکتا ہے۔

قرآن نے "كُلٌّ مِنَ الصّالِحِين " فرما کران تمام غلیظ اور جھوٹی نسبتوں کی نفی فرمادی۔

تقابلِ کتب وادیان کے ساتھ ساتھ سنجیدہ، علمی اور تحقیقی انداز میں فرق باطلہ کی تردید بھی ضروری ہے، آپ کے تلامذہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کون کون سے فرقے ہیں جو اسلام کے نام پر لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں......اور آج جبکہ روزانہ کسی نہ کسی نئے فرقے کا ظہور ہورہا ہے تو اس موضوع کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔

اور آخری بات جو کہنا چاہوں گا، وہ یہ کہ اپنے تلامذہ کی تربیت پر خاص توجہ دیں۔

اس موقع پر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا زریں قول یاد آرہا ہے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ: "معلم اگر صاحب ایمان ہو تو بائبل پڑھا کر بھی لوگوں کو مسلمان کرسکتا ہے اور اگر معلم کا سینہ ایمان سے خالی ہو تو وہ تدریسِ قرآن سے لوگوں کو گمراہ کرسکتا ہے۔"

محترم اساتذہ کرام! قرآن کے ذریعے بچوں کے اخلاق سنواریں، انہیں تقویٰ وللٰہیت کے مفہوم سے آگاہ کریں، نماز باجماعت کا پابند بنائیں، غیبت چغلی وغیرہ سے دور رہنے کی تلقین کریں، جھوٹ کی نفرت ان کے دلوں میں بٹھادیں، راست گوئی کو ان کی فطرت کا حصہ بنادیں تاکہ مستقبل کے یہ ائمہ وخطباء اور مدرسین ومجاہدین جب فارغ التحصیل ہوکر نکلیں تو ان میں ایک کامل انسان کی ساری خوبیاں موجود ہوں اور ان کا قول وعمل عام لوگوں کے لئے نمونہ عمل بن جائے۔

یاد رکھیئے! تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ایک استاذ کے فرائض میں شامل ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے بغیر وہ اپنی ذمہ داری سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

یہ چند تجاویز ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر "تدریسِ تفسیر" میں ان نکات کو ملحوظ رکھا جائے تو دلوں میں قرآن کی عظمت کا داعیہ ابھرے گا، درسِ قرآن کے حلقوں کو پذیرائی ملے گی، قرآنی بہاروں سے اس بے جان معاشرہ کو "حیاتِ نو" حاصل ہوگی۔ اور ایسے افراد تیار ہوں گے جن کے قلب ودماغ انوارِ قرآن سے منور ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قرآن کے تمام حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

حضرت مولانا مفتی ابولبابہ صاحب دامت برکاتہم

﴿مورخہ ۱۳؍مئی ۲۰۱۰ء بروز جمعرات صبح ۹:۰۰ بجے﴾

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين سيدنا محمد وعلى آله واصحابه أجمعين. أما بعد!

فقہ کی لغوی تعریف:

فقہ لغت میں کہتے ہیں: "العلم بالشئ"

کوئی بھی لفظ لغت سے جب اصطلاح کی طرف آتا ہے تو اس میں متعلقہ فن کی اصطلاحات وضع کرنے والے کچھ چیزوں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ فقہ کی تعریف میں بھی ایسے ہی ہوا ہے فقہ: لغةً "العلم بالشيء" کو کہا جاتا ہے اور مزید گہرائی میں جائیں تو لغت میں یہ تین طرح سے استعمال ہوتا ہے:

(۱) فَقِهَ يَفْقَهُ مكسور العين فى الماضى

(۲) فَقَهَ يَفْقَهُ مفتوح العين فى الماضى

(۳) فَقُهَ يَفْقُهُ مضموم العين فى الماضى

تو اس کی عین مثلث ہے۔ ماضی میں یہ "سَمِعَ" سے بھی آتا ہے، "فَتَحَ" سے بھی اور "كَرُمَ" سے بھی۔

جب مکسور العین ہو تو اس کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو سمجھنا۔

جب مفتوح العین ہو: "فَقَـهَ فُلانٌ" تو اس کا معنی ہوتا ہے: "سمجھنے میں کسی دوسرے پر سبقت لے جانا" ایک چیز کا اضافہ ہو گیا: سمجھنا اور دوسرے سے پہلے سمجھنا۔

جب مضموم العین فی الماضی ہو: "فَقُهَ فلان" اس کے معنی ہیں: "صار الفقه له سجية" یہ شخص نہ صرف سمجھا ہے، نہ صرف دوسرے سے پہلے سمجھنے لگ گیا ہے، بلکہ "سمجھنا" اس کا مزاج اور اس کی طبیعت کا ملکہ بن گیا ہے۔ اس کو فقیہ النفس بھی کہتے ہیں۔ "فقیہ" پہلے دو معنی کے اعتبار سے آئے گا۔ لیکن جب "فقیہ النفس" کہیں گے تو تیسرا ہی معنی مراد ہوگا کہ اس نے فقہ کو اتنا پڑھا پڑھایا ہے، وہ اس پر اتنی دسترس رکھتا ہے کہ حوادث اور جزئیات کا حکم نصوص اور قواعد شرع سے کے ما له اور ما عليه

معلوم کرنا اس کی طبیعت بن گئی ہے۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف:

اس لغوی تعریف سے اصطلاحی تعریف کچھ اضافی الفاظ کے ساتھ وضع کر لی گئی جو آپ سب کے علم میں ہے:

" هو العلم بالأحكام الشرعية الفرعية ، المكتسبة من أدلتها التفصيلية"

اس دنیا میں جتنے انسان رہتے ہیں ان سے جو اقوال وافعال صادر ہوتے ہیں اور جو افکار ان سے وجود پاتی ہیں، ان اقوال، افعال اور افکار پر شریعت کا کوئی حکم مرتب ہوتا ہے۔ اس حکم کو ''ادلہ شرعیہ'' سے معلوم کرنا ''فقہ'' کہلاتا ہے۔

آج کی مجلس میں اس عاجز کی کوشش ہوگی کہ چند ایسی باتیں عرض کر سکے کہ جن کو ملحوظ رکھ کر فقہ اور اصول فقہ پڑھنے پڑھانے کے نتیجے میں یہ چیز حاصل ہو سکے۔

لغوی تعریف کا حاصل یہ تھا: فقہ فہم سے شروع ہوا اور اس فہم کے مزاج پر راسخ ہو جانے پر آ کر ختم ہوا تو مطلب یہ نکلا کہ اس علم کا تعلق حفظ سے اتنا نہیں ہے جتنا فہم سے ہے۔ حفظ کے معنی انسان کی یادداشت میں کسی چیز کا محفوظ ہونا اور فہم کے معنی گزشتہ محفوظات کی مدد سے کسی چیز کی حقیقت کو سمجھنا۔ تو حفظ اور چیز ہے اور فہم اور چیز ہے۔

فقہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف میں بات کا رخ فہم کی طرف رہا ہے۔ حفظ کی طرف زیادہ نہیں ہے، چنانچہ فقہاء نے فرمایا ہے:

" من حفظ ألوفاً من المسائل لايسمىٰ فقيهاً"

متون اگر زبانی یاد بھی ہوں، لیکن فقیہ اس کو نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ ذہن میں موجود یادداشت کی مدد سے اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں پیدا ہو جاتی کہ یاد کی ہوئی چیز کی حقیقت کو بھی سمجھے اور اگر کوئی نئی چیز اس کے سامنے آ جائے تو اس کی مدد سے اس کے حکم کے استخراج کی صلاحیت بھی کسی قدر رکھتا ہو۔

اس استخراج کی صلاحیت کا اعلیٰ درجہ تو اجتہاد ہے (مستقل ہو یا غیر مستقل، مطلق ہو یا مقید) لیکن اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مجتہدین کے طرق استنباط کو سمجھ لیا جائے۔

اب یہ عاجز چند ایسی باتیں عرض کرے گا کہ ان سے ادنیٰ درجہ کے حاصل ہونے کے امکانات پیدا ہو جائیں، لیکن پہلے میں اب تک کی گفتگو کا خلاصہ ایک دوسرے اسلوب میں عرض کرتا ہوں:

علوم کی اقسام:

علوم دو طرح کے ہیں: ایک وہ علوم کہ جن کے اصول اور فروع پختگی کے عمل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مشمولات کو محیط ہونے کے عمل سے بھی گزر چکے ہیں، جیسے: علم تفسیر اور علم حدیث۔ اب اگر آیت کریمہ کا کوئی معنی لیں گے۔ آیت کریمہ اگرچہ حمال الوجوہ ہوتی ہے، لیکن اصول تاویل کی روشنی میں کوئی نئی تاویل کرنے کا امکان نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے۔ اب تک کی تحقیقات سے استفادہ ہی مطمح نظر ہوتا ہے۔

علم حدیث میں بھی اسی طرح سے ہے کہ حدیث شریف کی تشریح کے جتنے پہلو ہو سکتے تھے، محدثین نے اپنی بہترین کاوشوں کے ذریعہ ان میں سے سب کو یا اکثر کو بیان کیا ہوا ہے۔ ایک تو علوم کی یہ قسم ہے۔

علم فقہ علوم کی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے جس میں ہر روز، ہر لمحے، ہر زماں و مکاں میں حوادث اور نئی نئی جزئیات کا اضافہ ہوتا ہے اور علم فقہ کے ذریعے ان کے احکام بیان کیے جاتے ہیں۔

چنانچہ جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے یعنی اسلام ہر مکان اور زمان کے لیے ہے، تو ہر زمان اور مکان کے حوادث کا اہل اسلام یا علمائے اسلام حکم نہیں بتلائیں گے تو مذکورہ بالا دعوٰی کیسے ثابت ہوگا؟ لہٰذا دوسرے علوم کی بنسبت اس علم میں موجود درسی مواد کو اس طرح سے پڑھنے پڑھانے کی کہیں زیادہ اہمیت ہو جاتی ہے کہ جس کے پڑھنے پڑھانے کے بعد یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ انسان کا ذہن غیر درسی مواد، غیر مستخرج، غیر موجود فی دفاتر الفقہ کا حکم درست طریقے پر سوچنا شروع کر دے۔

فقہ میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے پہلی چیز: خلاصۃ الباب یاد رکھنا:

سب سے پہلے فقہ پڑھنے پڑھانے کے دوران جس چیز کا خیال رکھنا چاہیے جس سے اس علم اور فن میں جان پیدا ہوتی ہے، وہ ہے خلاصۃ الباب کا یاد رکھنا!

فقہاء نے جب یہ علم مدون کیا، تو بڑی معقول اور مربوط شکل میں مدون کیا، مثلاً: باب کے شروع میں وہ ''مبادی الباب'' بیان کرتے ہیں یعنی تعریف، اقسام، ارکان، شرائط......اور خاتمۃ الباب میں عوارض یا توابع بیان کرتے ہیں اور اصل مرکزی بحث جو بیچ میں ہوتی ہے، اس کو ''مقاصد الباب'' کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بھی باب پہلے مبادی پر مشتمل ہوتا ہے، پھر مقاصد پر آتا ہے اور پھر عوارض اور توابع پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

جب تک خلاصۃ الباب مستحضر نہ ہو اس وقت تک اس باب کے مقاصد سمجھ میں نہیں آتے، کیونکہ فقہ کا علم ایسا ہے کہ اس کے بعض ابواب دوسرے بعض ابواب کے سمجھنے کے لیے معاون بھی ہوتے ہیں اور موقوف علیہ بھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاں یہ بحث چلتی ہے کہ مجتہد مستقل ہی ہوگا یا غیر مستقل بھی ہو سکتا ہے یعنی تمام ابواب میں اجتہاد کرنے والے مجتہد کہلانے کے مستحق ہونگے؟ یا ایسا ممکن ہے کہ کسی ایک باب میں کسی ایک موضوع میں کوئی اجتہاد کے درجہ کو پہونچ جائے اور دوسرے ابواب میں وہ اجتہاد کے درجہ کو نہ پہونچا ہوا ہو؟ تو جو حضرات کہتے ہیں کہ اجتہاد میں تجزی نہیں ہوتی وہ یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی مجتہد ہوگا تو تمام ابواب میں ہوگا اور ایسا ممکن ہونا مشکل ہے کہ ایک باب میں مجتہد ہو اور دوسرے ابواب میں نہ ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ کچھ ابواب کا سمجھنا دوسرے ابواب کے سمجھنے پر موقوف ہوتا ہے تو جب ان دوسرے ابواب میں اجتہاد کا مادہ نہیں ہے تو گویا متعلقہ ابواب میں بھی بالکلیہ اجتہاد کا ملکہ پیدا نہیں ہوا۔ اجتہاد میں تجزی ہے یا نہیں؟ یہ ایک مستقل بحث ہے مگر اتنی بات متفق علیہ ہے کہ فقہ کے بعض ابواب، دیگر بعض ابواب کے سمجھنے پر موقوف ہوتے ہیں تو جب تک خلاصۃ الباب یاد نہ ہو تو مقاصد الباب پر نظر نہیں رہ سکتی اور جب مقاصد الباب پر نظر نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ اس باب میں رسوخ حاصل نہ ہوگا، بلکہ دوسرے ابواب پر بھی گرفت کمزور ہو جائے گی۔

خلاصۃ اللباب یاد کرنے کا طریقہ:

خلاصۃ اللباب کے یاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سبق جب آگے جائے تو باب کے شروع سے جو موٹا موٹا خلاصہ ہو وہ اگلے سبق کے ساتھ دہرا کر بیان کرنا چاہیے۔اس سے جو نئی چیز سامنے آرہی ہے۔یہ اس کے لئے تمہید بن جاتی ہے اور اس کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے اور آخر باب تک اسی طرح دہرایا جاتا رہے تو بار بار تکرار کی وجہ سے آخر تک پہنچتے پہنچتے پورے باب کا خلاصہ کافی حد تک ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

پچھلے زمانے میں علم میں پختگی کے لیے یوں کیا جاتا تھا کہ ہر فن سے ایک متن یاد کیا جاتا تھا۔ ''کتاب المتون'' حفظ کرنے کے لئے الگ سے چھپی ہوئی ہوتی تھی اور چونکہ ہمارے زمانے میں حفظ المتون کا سلسلہ نہیں رہا، لہذا اگر خلاصۃ اللباب یاد کرلیا جائے تو کافی حد تک یہ حفظ المتن کا قائم مقام ہوجاتا ہے، مثلاً: مسح علی الخفین ایک باب ہے۔اس کا خلاصہ کیسے ہوگا؟ دیکھیے! خود بخود ایک عقلی منطقی ترتیب سے فقہاء نے بیان کیا ہوا ہوگا۔وہ یہ کہ پہلے تو اس کا ''وصف شرعی'' یعنی حکم کا ذکر ہوگا کہ وہ جائز ہے یا بدعت ہے؟...... مسنون ہے یا مباح ہے؟ حکم کے بعد ''شرط'' کا بیان ہوگا۔اس کے بعد اس کا ''وقت''۔یہ سب مبادی کہلائیں گے اور اس کے بعد مقاصد اللباب موضع مسح، عدد مسح، کیفیت مسح وغیرہ بیان ہوں گے اور خاتمہ میں جاکر نواقض کا بیان ہوگا۔

فقہ میں رسوخ کے لئے دوسری چیز: قواعد فقہ کو یاد رکھنا:

دوسری چیز جس کے بغیر علم فقہ بے جان رہتا ہے، متعدی نہیں ہوتا اور کتاب میں موجود علم فقہ باہر کی دنیا میں پیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے انسانی ذہن میں صلاحیت اور استعداد نہیں پیدا کرتا اور اپنے اندر کی طرف سمٹتا ہے۔سکڑتا ہے۔باہر کی طرف نہیں پھیلتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قواعد فقہ کو فقہ پڑھتے پڑھاتے وقت ملحوظ نہیں رکھا گیا ہوتا۔لہذا فقہ کی کتاب پڑھنے سے پہلے قواعد فقہ پڑھا دیے جائیں اور جب مسئلہ کی دلیل میں کوئی قاعدہ آئے تو طالبعلم کے سامنے اس کی وضاحت کی جائے کہ یہ مسئلہ اس قاعدہ کی روشنی میں نکلا ہے۔جب ہم فرع کو اس کی اصل کے ساتھ نہیں جوڑتے، جزئیہ کو

قاعدہ سے مربوط کر کے نہیں بیان کرتے تو اس سے یہ علم محدود ہونا شروع ہو جاتا ہے اور مستنبط کی گنجائش پھر کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے صاف کہہ دیا:

"کل فقه لم یخرج علی القواعد، لیس بشيء"

چنانچہ فقہاء "فقہ غیر مخرّج علی القواعد" کو کچھ مانتے ہی نہیں، کیونکہ یہ جو کتابی شکل میں مسائل موجود ہیں یہ جزئی ہیں اور **الجزئيُّ لایکون کاسبا ولا مکتسباً** بلکہ اس کے پیچھے جو کلی ہے وہ کلی یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ اس جیسی دوسری جزئیات کا حکم بھی نکال سکے۔ فقہاء کا مذکورہ قول از قبیل ترہیب تھا کہ اگر قاعدہ کے ساتھ نہیں پڑھا پڑھایا گیا تو اس فقہ کا فائدہ محدود ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور جس نے فقہ کو قواعد فقہ پر منطبق کرتے ہوئے پڑھا تو اس بارے میں فقہاء ترغیباً فرماتے ہیں:

"من حفظ الفقه بقواعده، استغنیٰ عن حفظ أکثر الجزئیات لاندراجها في الکلیات".

یعنی قواعد کے بغیر پڑھا **فلیس بشيء**: یعنی یہ جزئیات مستحضر نہیں رہیں گی اور جس نے فقہ کو ان قواعد کے ساتھ پڑھا: " **استغنیٰ عن حفظ أکثر الجزئیات لاندراجها في الکلیات**"

چنانچہ دنیا میں کوئی بھی عقلی فقہی دلیل ایسی نہیں ہو سکتی کہ جس میں کوئی قاعدہ کلیہ فقہیہ نہ ہو۔ فقہی ذخیرے میں یہ ناممکن ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ عقلی دلیل فقہاء بیان کریں یا کوئی اور، اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے عقلی دلیل کوئی بھی صاحب عقل پیش کرے تو وہ تین قسم سے خارج نہیں ہو سکتی اور تینوں قسم میں کسی قاعدہ کا ہونا ضروری ہے۔

اب یہاں پر تھوڑی سی منطق آجائے گی جس کے لیے بالکل معذرت نہیں چاہوں گا۔ ایک چیز جب قرآن کریم کے اندر موجود دلائل میں بھی موجود ہے، حدیث شریف میں بھی ملتی ہے، اور فقہ میں بھی اپنا وجود رکھتی ہے تو ہم اتنی اس کی غیبت کریں کہ اس کے نقصانات سے بچنے کی ترغیب دیتے دیتے اس کے فوائد سے بھی اجتناب کرنے کی تاکید شروع کر دیں۔ یہ کوئی اچھا رجحان تو نہ ہوگا۔ میں اس پر کس چیز کی معذرت چاہوں؟

دلیلِ عقلی کی تین اقسام:

مناطقہ نے حصر عقلی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دلیل تین قسموں میں سے ایک قسم ہوگی اور ہمارے یہاں وہ پڑھی پڑھائی بھی جاتی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے! منطق کی کتابوں میں تو وہ ہے ہی، فقہ کی کوئی کتاب کسی صفحے سے، حاشیہ، متن سے، کہیں سے آپ کھول لیں اگر اس میں دلیل نام کی چیز موجود ہے تو وہ ان تین سے خارج نہیں ہے۔ یعنی یا وہ قیاس اقترانی ہوگی یا قیاس استثنائی ہوگی یا تمثیل اور تینوں ایک قاعدہ کلیہ پر مشتمل ہوں گی۔

قیاس اقترانی کی شرائط:

قیاس اقترانی کے درست ہونے کے لیے شرط ہے کہ اس کے مقدمات میں سے پہلا موجبہ ہو اور دوسرا کلیہ ہو۔ کلیہ ہونے کا مطلب یہ کہ اس کے اندر قاعدہ موجود ہو۔ اگر دلیل کے کسی مقدمے میں کوئی ایک قاعدہ بھی نہیں ہے تو گویا آپ ایک جزئی کے ثبوت کے لیے دوسری جزئی کو پیش کر رہے ہیں تو خود اسی جزئی کو کوئی نہیں مانتا تو اس کی روشنی میں دوسری جزئی کو کیسے مانے گا؟ آپ جزئی کے لئے کوئی قاعدہ پیش کریں، اس قاعدہ کو اگر آپ منوالیں تو یہ جزئی بھی مان لی جائے گی اور اس جیسی لامحدود سینکڑوں ہزاروں جزئیات مان لی جائیں گی۔

قاعدہ فقہیہ کے استخراج کا طریقہ:

کتب فقہ میں کوئی عقلی دلیل آجائے تو یہ ممکن نہیں اس میں قاعدہ فقہیہ نہ ہو، لہذا اس قاعدہ فقہیہ کا ستخراج کرنا چاہیے اور اس کے لیے لازمی ہے کہ عربی شروحات دیکھی جائیں۔

اگر اردو شروح سے فقہ، اصول فقہ پڑھی پڑھائی جائے گی تو اس سے حفظِ فقہ تو کسی قدر حاصل ہو جائے گا، لیکن فہم نہیں حاصل ہوگا اور فہم جا کر مزاج اور طبیعت بھی بن جائے تو یہ مرحلہ تو بہت دور کا ہے۔ صرف حفظ حاصل ہوگا اور فقہ کو حفظ کر لینے والا عوام کی نظر میں تو شاید فقیہ ہو یا فقہ کا مدرس ہو، اہل فن کی نظر میں یہ فقیہ نہیں ہے۔

فقہ کے قواعد ہمارے یہاں الگ سے ترتیب کے ساتھ جمع شدہ دو کتابوں میں ملتے ہیں۔

الاشباہ والنظائر میں ۶۴ قواعد ہیں اور شرح المجلۃ میں ۹۹ ۔کل ۱۶۳ ہوئے اوران دونوں کتابوں میں موجود قواعد کے موازنہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۴۲ مشترک ہیں۔گویا غیر مشترک ۱۲۱ ہوئے۔ یہ قواعد ،کتب فقہ پڑھنے پڑھانے سے پہلے یا ساتھ، پڑھنے پڑھانے والوں کو یاد ہونے چاہئیں، تا کہ جب دلیل کے سیاق میں کوئی قاعدہ آجائے تو اس کی طرف اشارہ کرنا کافی ہو۔اگر تدبر کیا جائے تو ان ۱۲۱ قواعد کے علاوہ بھی بہت سے ایسے قواعد ہیں جن سے فقہاء استدلال کرتے ہیں۔انہوں نے اس فہرست میں ان کو شامل نہیں کیا، اس لیے کہ ان کا تعلق عقل عام سے ہے۔ان کو قواعد شرع میں با قاعدہ داخل کرنے کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں ہے، جیسے ایک قاعدہ ہے:"ماقارب الشيء، یاخذحکمه" یا" ماقام مقام الشيء، یجری علیه حکمه" تو سمجھ میں آنے والی چیز ہے کہ ماقارب الشيء، یاخذحکمه عقل عام اس کو تسلیم کرتی ہے اسی طرح إذا جاء الأصل بطل الخلف اور إذا جاء الأصل قبل حصول المقصود من الخلف، بطل الخلف.

یعنی خلف اصل کا حکم لے لیتا ہے اور اگر اس حکم کی تکمیل سے پہلے اصل آ گیا تو خلف کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔اس چیز کو عقل عام تسلیم کرتی ہے لہذا انہوں نے باقاعدہ اس فہرست میں شامل نہیں کیا اگر اس فہرست میں غیر شامل شدہ قواعد کا بھی تتبع کیا جائے کہ آدمی جس دلیل سے گزرے تو غور کرے کہ اس میں فقہ یا اصول فقہ کا کونسا قاعدہ موجود ہے؟ تو وہ عقل عام کے تحت آنے والی بہت سی تسلیم شدہ صداقتیں یعنی قواعد عامہ کو موجود پائے گا۔

فقہی مسائل کی تجزی:

فقہی مسائل کے تین جزء ہیں۔صورتِ مسئلہ، حکمِ مسئلہ، دلیلِ مسئلہ۔فقہاء نے صورت سوچی کہ دنیا میں ایسا پیش آیا ہے یا پیش آسکتا ہے اور پیش آنے کا امکان کثیر ہے یا قلیل یا نادر، اگر نادر الوقوع بھی کوئی چیز تھی تو انہوں نے سوچی۔ یہ صورت مسئلہ ہوا۔اور ادلہ شرعیہ کی روشنی میں (جو عقلی اور نقلی دونوں قسم کے ہیں) ان کی روشنی میں اس صورت مسئلہ کا جو ابھی تک مفروض ہے (واقع ہونا کوئی ضروری نہیں) اس کا حکم کیا نکلتا ہے؟ وہ حکم ایجاب میں ہے یا سلب میں یعنی وہ فرض، واجب، مسنون، مستحب ہے یا وہ مکروہ حرام مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی، مباح ہے۔وہ ایجابی ہے، یا سلبی ہے؟

لیکن ہے کیا؟ یہ حکم مسئلہ ہوا۔
اور تیسری چیز خود سامنے آگئی کہ وہ دلیل جس سے ہم نے اس صورت کا یہ حکم نکالا ہے وہ کیا ہے؟
تو اب تین جزء ہوگئے: صورت مسئلہ، حکم مسئلہ، دلیل مسئلہ۔

درسی کتب فقہ کی دو اقسام:

کتب فقہ جو ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں ایک متون، جیسے قدوری، کنز، وقایہ، مختار، ان میں صورت اور حکم ہوتا ہے، دلیل نہیں ہوتی۔ دوسری قسم وہ کتابیں ہیں جن میں متن کے ساتھ شرح بھی پڑھائی جائے، ان میں دلیل بھی ہوتی ہے، جیسے: شرح وقایہ اور ہدایہ۔ ان کے اندر تینوں اجزاء ہوتے ہیں! صورت بھی، حکم بھی اور دلیل بھی۔ گویا ہمارے نصاب میں شامل دو کتابیں قدوری اور کنز تو صورت اور حکم سے بحث کرتی ہیں۔ دلیل شرح میں یا حاشیہ میں موجود ہوتی ہے جو مدرس کو اس کا خلاصہ تیار کر کے بیان کرنا پڑتا ہے اور شرح وقایہ اور ہدایہ دو ایسی کتابیں ہمارے اس برِ صغیر کے نصاب میں موجود ہیں جس کے اندر تیسرا جزء بھی ہوتا ہے، صورت اور حکم کے ساتھ دلیل بھی۔

اب جو دلیل کسی صورت کا حکم ثابت کر رہی ہوتی ہے وہ نقلی ہوگی یا عقلی؟ اگر وہ دلیل نقلی ہے تو اس میں اصولِ فقہ کا اجرا ہونا چاہیے اور اگر وہ دلیل عقلی ہے تو اس میں قواعد فقہ کا اجرا ہونا چاہیے۔

دلائل کے اجراء کا طریقہ:

دلیل نقلی کتاب اللہ سے ہے تو مدرس کو بیان کرنا چاہیے کہ اس آیت سے جو استدلال کیا گیا ہے یہ عبارۃ النص ہے یا دلالۃ النص یا اشارۃ النص؟ اور کتاب اللہ سے جو نص لی گئی ہے یہ ظاہر، مفسر، محکم ہے؟ یا خفی، مجمل، مشکل، متشابہ؟ اگر دلیل نقلی سنتِ رسول ﷺ سے ہے تو سنت کی کونسی قسم سے ہے؟ اس کو بیان کرنا چاہیے۔ اگر اجماع ہے تو اس کو بیان کرنا چاہیے کہ اجماع صریحی ہے یا سکوتی، اجماع مفرد ہے یا مرکب؟ اور اگر دلیلِ عقلی ہے تو وہ بھی تین قسم سے خالی نہیں: اقترانی، استثنائی اور تمثیل۔ یہ تمثیل وہی قیاس ہے تو دلائل نقلیہ تین قسم سے خالی نہیں ہونگے۔ اصول فقہ کا جو مسئلہ یہاں سے متعلق ہے اس کو جاری کرنا چاہیے، نہیں جاری کرتے تو ہلکی سی خوشبو تو سونگھانی چاہیے طالبعلم کو!

اور جب دلیل عقلی آجائے گی تو اس کے اندر قاعدہ کلیہ فقہیہ کون سا موجود ہے؟ وہ مسئلہ بیان

کرنے سے پہلے بیان کر دینا چاہیے کہ یہ مسئلہ ایک اصول پر کھڑا ہوا ہے۔ مشہور قواعد تو بالکل مستحضر ہونے چاہئیں، مثلاً:

للأ کثر حکم الکل، التابع لایفرد بالحکم، إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه

جب ہم نے اسلام کو عالمگیر مذہب مانا ہے اور دائمی مذہب مانا ہے کہ ہر زمان و مکان میں نافذ ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی مکلف سے ایسا کوئی فعل صادر نہیں ہو سکتا جو ان قواعد میں سے کسی قاعدے کے احاطہ میں آتا نہ ہو یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے۔ یہ مسلمہ نظریہ کے خلاف ہو جائے گا، لیکن ہم ایسا کر کیوں نہیں سکتے؟ وجہ یہ ہے کہ دلائل نقلی گزرے اور ترجمہ پر اکتفا کر لیا گیا جب کہ فقہ کے طالبعلم کو لغوی ترجمہ کی ضرورت ۸۰ فیصد نہیں پڑتی۔ ۲۰ فیصد کوئی نئی لغت آ جائے گی تو پڑے گی۔

مثلاً: " **الملك الثابت استناداً ملك ضعيف**" اب **الملك الثابت استناداً** یہاں استناداً کے لفظ کے لیے اس کو ترجمے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ استناد سے یہاں مراد ٹیک لگانا ہے بلکہ "استناد" کا جو معنی فقہ میں اصطلاحاً مراد لیا جاتا ہے اس کی ضرورت پڑے گی۔

اسی طرح **ملك ضعيف** میں اس کو ترجمے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ فقہ میں ملک ضعیف سے کیا مراد ہے؟ اس معنی مراد کی اسے ضرورت ہے۔ اسی طرح قدوری کی پہلی دلیل قال اللہ تعالیٰ:

یاایها الذین آمنوا إذاقمتم إلی الصلاة فاغسلوا وجوهکم

اس کے ترجمہ کی اس کو ضرورت کیا ہے؟ اس کے ترجمہ میں تو اصول فقہ کا اجرا ہونا چاہیے مثلاً: یہ کہ دلیل نقلی از کتاب اللہ استدلال بعبارۃ النص" یہ ترجمہ ہونا چاہیے اور جب دلیل عقلی آ جائے تو پہلے سے بتا دے کہ یہ مسئلہ اس قاعدہ پر مبنی ہے یا اس ضابطہ پر کھڑا ہے۔

قاعدہ اور ضابطہ میں فرق:

آپ کو ضابطہ اور قاعدہ میں فرق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ قاعدہ وہ ہے جو اکثرُ من باب میں جاری ہو اور ضابطہ وہ ہے جو کسی ایک باب سے تعلق رکھتا ہو، جیسے: **الماء لا یعطی له حکم الاستعمال قبل الانفصال** یہ ضابطہ ہے جو صرف باب الطہارت میں جاری ہوگا۔

اور قاعدہ کی مثال ہے: الیقین لایزول بالشک اب یہ قاعدہ طہارت کے علاوہ کئی ابواب میں جاری ہوتا ہے۔

قاعدہ ذہن نشین کرانے کا طریقہ:

مسئلہ بیان کرنے سے پہلے ضابطہ یا قاعدہ مدرس عربی الفاظ میں باآواز بلند بیان کردے کہ یہ مسئلہ اس قاعدہ پر مبنی ہے اور اگر وہ قاعدہ پہلے ان یاد کیئے ہوئے قواعد میں سے تھا تو طالبعلم سے پوچھے: تم سناؤ۔ اگر ان میں سے نہیں تو خود پڑھ کر سنادے۔

قاعدہ اس کو پہلے بیان کردینا چاہیے اور جب یہ قاعدہ اس نے مسئلہ سے پہلے بھی بیان کیا اور مسئلہ کی دلیل سمجھانے کے دوران بھی بیان کیا تو اب آہستہ آہستہ طالبعلم کے ذہن میں یہ بات آنی شروع ہوجاتی ہے کہ یہ مربوط اور معقول فن ہے۔

دو چیزیں ہوگئیں، پہلی کہ جب بھی کوئی باب شروع کیا جائے آخر تک اس کا عقلی منطقی ربط ہوتا ہے۔ پہلے اس کے مبادی پھر مقاصد اور آخر میں عوارض ہوتے ہیں۔ ہر سبق کے ساتھ پچھلے اسباق کا خلاصہ بیان کر کے آخر باب تک جانا چاہیے۔ یہ جب مستحضر ہوجائے گا اگلے باب کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے، جیسے: القرآن یفسر بعضہ بعضاً تو دوسرے علوم کا بھی یہی حال ہے کہ ایک علم دوسرے علم میں فائدہ دیتا ہے اور ہر علم کا ایک باب دوسرے باب میں فائدہ دیتا ہے۔

اور دوسری چیز جن کتابوں کے اندر دلائل بھی موجود ہیں، یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ تو اس میں دلائل نقلیہ میں اصول فقہ کا اور عقلیہ میں قواعد فقہ کا اجرا ہونا چاہیے۔

آخر میں چند عمومی باتیں پیش خدمت ہیں:

درس نظامی کی خصوصیت:

ہمارے نظام تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ آٹھ سال میں اڑتالیس کتابیں پڑھ لینے سے یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ آپ اڑتالیس ہزار بلکہ اڑتالیس لاکھ کتابوں کے مطالعے اور ان سے استفادہ کے قابل ہوگئے ہیں۔ وہ خصوصیت کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں طالب علم کو سبق

سے تین بار گزارا جاتا ہے سب سے پہلے اسے سمجھایا جاتا ہے کہ سبق میں آنے سے پہلے مطالعہ کر کے آؤ۔

مطالعہ تیار کرنے کا طریقہ:

مطالعہ تیار کرنے کا مطلب یہ کہ عبارت میں دیکھے کہ کوئی نیا صیغہ آیا ہے تو اسے صرفی رو سے حل کرے اور پھر نحوی رُو سے اس کی ترکیب دیکھ لے کہ موصول، صلہ، شرط، جزا، مبتدا اور خبر کہاں ہے؟ اور صرف و نحو سے گزرنے کے بعد لغۃً بھی دیکھ لے کہ کوئی نیا لفظ تو نہیں آیا ہوا؟ بین السطور یا حاشیہ میں اس کا کیا مطلب بیان ہوا ہے؟

دوسری مرتبہ وہی چیز سبق کے دوران نظر سے گزرے گی اور سبق میں حاضر باش ہو کر بیٹھنے کا یہ طریقہ بتلایا جائے کہ صبح جب سبق میں جاؤ تو موازنہ کرو کہ آپ کی سمجھ کی تائید استاد کی تقریر کہاں تک کر رہی ہے؟ کہاں تک اس کی تغلیط یا تصحیح ہو رہی ہے؟

تیسری بار تکرار کرو وہ یہ کہ اپنی کوشش سے اور استاد کے تجربہ اور علمیت سے استفادہ کے بعد اب جو یہ ضبط میں آیا اس کو اپنے ساتھی کے سامنے بیٹھ کر دہراؤ۔ ساتھی نہیں تو اپنی ٹوپی اتار کر سامنے رکھ دو اور اسے سمجھاؤ۔ اب تک بات تھی نظر کی یعنی مطالعہ، پھر سماعت کی یعنی درس، اب زبان کو بھی اس میں استعمال کرو، تو جب یہ نظر، پھر سماعت، پھر لسان تینوں استعمال ہوتی ہیں تو ''ترپھلا'' بن جاتا ہے۔ یعنی تین چیزوں کا مجموعہ، ترپھلا طب کا مشہور نسخہ ہے۔

یہ تکون مل کر طالبعلم کے اندر ایک ایسی استعداد پیدا کر دیتی ہے کہ جس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے دن فارغ عن التحصیل نہیں ہوا فارغ مع التحصیل ہوا ہے کہ اب یہ اس قابل ہوا کہ مطالعہ شروع کرے۔

مدرس کے مطالعہ کا طریقہ:

ایسے ہی مدرس کو بھی تین مطالعے کرنے چاہئیں ایک مطالعہ فہم اور استذکارِ فہم کے لیے کہ وہ جو زمانہ طالبعلمی میں پڑھا تھا آج اس یادگار کو دہرا کر پھر لطف تو لیں۔

دوسری مرتبہ افہام کے لیے، اسی مقدار سبق کا کچھ مطالعہ کہ حدیث انفس ایسی تیار کرے کہ صبح طلبہ کو جا کر سمجھا سکے۔

تیسرا مطالعہ تسہیل افہام کے لیے کہ کل جو سبق سمجھانے کے دوران الفاظ اپنی زبان سے نکالے وہ منتخب، مختصر، جامع اور اقرب الی الوصول ہونے چاہئیں۔ ان تین مطالعوں سے ایک مدرس کو گزر کر جانا چاہیے۔

اس دوران ایک ضمنی بات یہ ہے کہ افراط وتفریط سے بچنا چاہیے تفریط یہ ہے کہ آدمی صرف اردو شروحات کا مطالعہ کرتا ہے۔ ہم اردو شرح کو دیکھتے ہیں (اور طالبعلم کو تیار اس لیے کر رہے ہیں کہ ہماری تراشِ عربی سے استفادہ کرنے کے قابل ہو جائے) اور تیار کرنے والا خود اپنے آپ کو اردو ذخیرہ سے تیار کر کے لا رہا ہے۔

یہ ہے اپنے فن سے لگن!

یہ ہے اپنے پیشہ سے اخلاص!

اور یہ ہے خلوص اور للہیت اور ایثار کا نمونہ!

لہٰذا عربی شروحات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وگرنہ تفریط ہوگی۔

اور افراط یہ ہے کہ آدمی جو کچھ مطالعہ کرے تو اس کا واحد مصرف یہ سمجھے کہ سارا کچھ کل طلبہ کو سنا کر ہی آنا ہے، بالکل غلط رجحان ہے۔

مدرّس کا مطالعہ طالبعلم کے مطالعہ سے تین گنا ہونا چاہئے لیکن وہ بیان صرف ایک ثلث کرے اور دوسرا ثلث جو اس کے پاس ہے اس سے وہ منتخب کر کے کہیں کہیں کوئی نکتہ بیان کرے اور تیسرا ثلث وہ اپنے استادی کے صدقے کے طور پر محفوظ رکھے کہ اگر کسی طالبعلم نے غیر متوقع سوال کر لیا تو جواب حاضر ہے۔ اس دن اس کی محنت وصول ہو جاتی ہے اگرچہ کی تھی اس نے سارا سال اور سوال کسی نے سال میں ایک ہی بار کیا تو مدرس کو تین مطالعہ کرنے چاہئیں لیکن افراط تفریط سے بچتے ہوئے۔

مقارن مطالعہ کا اہتمام:

آپ فقہ کی کسی کتاب کا...... چاہے وہ پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے دو متن ہوں، قدوری اور کنز،

یا دوسری قسم سے رکھنے والی دو شروحات ہوں، شرح وقایہ اور ہدایہ۔ جب آپ ان کا ان کی عربی شروحات کی روشنی میں مطالعہ کر لیں تو پھر مقارن مطالعہ کے لیے دو کام کریں یا کم از کم دو میں سے ایک ضرور کریں۔ اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ دو چیزوں کا مقارن مطالعہ کریں ایک تو اس شاندار کتاب کا جو سارے فقہی دفاتر کا نچوڑ ہے۔

شامیہ کا مطالعہ:

اسلام کی تاریخ میں فقہ پر ساڑھے بارہ سو سال میں جو کام ہوا وہ سارا پوری تنقیح اور ترجیح کے ساتھ "رد المحتار علی الدر المختار" کی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ آپ نے جو سبق قدوری میں دیکھا ہے اسے اللباب اور الجوھرہ میں دیکھ لیا۔ اسی طرح ہدایہ میں عنایہ و کفایہ بالاستیعاب دیکھیں اور فتح القدیر بالانتخاب دیکھ لی بس کافی ہے۔ اس کے بعد آپ وہی جگہ شامیہ میں نکالیں۔ یقین کریں کہ میں نے لفظ استعمال کیا تھا تنقیح اور ترجیح اگر آپ صرف اسی شروحی مطالعے تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے تو مسئلہ منقح ہو کر سامنے نہیں آئے گا۔ ذہن میں الجھنیں اور پیچیدگیاں رہیں گی اور اگر آپ اسی مطالعہ تک محدود رہیں گے تو آپ کے سامنے ترجیح نہیں ہو سکے گی یہ دونوں باتیں آپ کے ہاتھ میں شامیہ کے مقارن مطالعہ سے آئیں گی۔

اور کتب فقہ کی ترتیب تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے، باب کی باب سے، اجزائے باب کی اجزائے باب سے، آپ کو وہ جگہ نکالنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ خصوصاً جو حضرات مدرسین متخصص فی الافتاء بھی ہیں ان کو یہ اختیار بھی نہیں دینا چاہیے، انہیں دونوں مقارن مطالعہ ضرور کرنے چاہییں۔

اکابر کے مستند فتاوی کا مطالعہ:

دوسرا مقارن مطالعہ، فقہ پڑھتے پڑھاتے وقت ہمارے اکابر کے مستند فتاویٰ کا کرنا چاہیے جو باب آپ یہاں پڑھا رہے ہیں، اردو فتاویٰ میں سے مستند فتاویٰ لے لیں، یہی باب وہاں بھی کھول لیں بلکہ باب نہ کھولیں اس کی فہرست شروع میں ہے وہ کھولیں اور اس فہرست پر ایک نظر ڈالیں۔ آپ نے آٹھ سال تک پڑھا اور پانچ سال سے آپ پڑھا بھی رہے ہیں۔ آپ اپنا امتحان خود لیں کہ اس

فہرست میں جو مسائل پوچھے گئے ہیں اس میں سے کون سا مسئلہ ایسا ہے، جو مجھے نیا لگ رہا ہے۔ وہ جگہ نکالیں اور مطالعہ کریں سارے کا مطالعہ نہیں کہہ رہا بلکہ صرف وہ جو آپ کو نہیں آتا اس کا مطالعہ کریں۔

آپ اس فن کے وارث ہیں۔ روز قیامت آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔ بقیہ باتیں چھوڑ دیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، یہ سب وقف اموال سے ہے اور روز قیامت ہم امت کے سامنے جوابدہ ہیں کہ ہم نے اس کی نئی نسل کو کیا دیا تھا؟ ہم کو اپنے اس فن سے عشق نہیں ہے۔ اپنے اس فن سے ایسا لگاؤ نہیں ہے، ایسا شغف نہیں ہے کہ ہم دنیا کی ساری چیزیں کو اس کی خاطر چھوڑ دیں۔ ساری لذتوں اور راحتوں سے زیادہ لطف اور سکون ہم کو مطالعہ، تحقیق اور مشکل عبارت کے حل کرنے میں آتا ہو۔ اس طرح کا عشق ہمیں نہیں ہے اور دنیا میں لوگوں کو اپنے فنون سے ایسا ہی عشق ہے، اس لیے انہوں نے اس مردار دنیا کا حق ادا کیا اور ہم نے ہمیشہ رہنے والی جنت کی خاطر حق ادا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کی کمی ہے۔ یہ لگن اور تڑپ ہو۔ پہلے تو مجھے آنا چاہیے۔ میری پہچان یہی چیز ہے۔ مجھے اس چیز کے عوض میں یہ امت عزت دیتی ہے۔ عظمت دیتی ہے۔ مجھے قابل احترام سمجھتی ہے۔

آپ اس فہرست میں دیکھیں کہ مجھے کونسا مسئلہ نہیں آتا اس کو نکالیں۔ حکم تو آپ زبانی یاد کرلیں۔ یہ آپ کو آنا چاہیے۔ یہ بہت عجیب بات ہوگی کہ آپ جب ہدایہ کا ایک مسئلہ پڑھیں مثلاً:

"ومن اشترى عشرة أسهم من مائة سهم من دار، فالبيع جائز"

تو آپ وہاں پر حصہ مشاعہ سمجھاتے ہوئے اسٹاک ایکسچینج کا حکم نہ سمجھائیں بہت عجیب بات ہوگی۔ "بیع صَرف" کے اندر تقابض بدلین مجلس کے اندر اندر ضروری ہے ورنہ بیع باطل ہے جب آپ باب الصرف پڑھا رہے ہیں تو منی ایکسچینج کے مسائل آپ کو نہ آتے ہوں تو یہ بڑی عار کی بات ہے۔ عار کی بات یہ نہیں ہے کہ مولوی کے پاس قراقلی نہیں، شروانی نہیں، سنہرا چشمہ نہیں، چمکتے بوٹ نہیں، کہ وہ کسی تقریب میں نہیں جاسکتا۔ یہ چیزیں کیا ہوتی ہیں؟ ان چیزوں کو عزت تو ہمارے پاؤں تلے آکر ملتی ہے!!

حکم آپ یاد کریں اور دلیل مسئلہ میں جو عبارت وہاں موجود ہوگی یہی عبارت آپ کی کتاب میں

بھی ہوگی یا اس سے ملتی جلتی ہوگی۔ یہ عبارت مفتیان کرام شامیہ سے لیتے ہیں۔ یہی عبارت آپ کے ان دونوں متون میں یا ان دونوں شروح میں موجود ہوگی اور جب وہ عبارت آپ کی سمجھ میں آجائے تو وہ مسئلہ آپ وہاں بیان کردیں۔

یہ دو باتیں میں آخر میں کہنا چاہتا تھا: ایک تو یہ کہ تین دفعہ مطالعہ کر کے سبق میں جانا چاہیے اور دوسرا یہ کہ مقارن مطالعہ کرنا چاہیے۔ تین دفعہ مطالعے کی ایک ترتیب ہے جو حفظ کرنے کرانے میں بعض ماہر فن قاری حضرات کے پاس ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ ایک دن میں دو دن کا سبق یاد کراتے ہیں ایک کچا اور ایک پکا۔

یعنی سبق دس سطر آگے دیا گیا ہے، لیکن وہ طالبعلم سے بیس سطریں تیار کراتے ہیں۔ دس تو اس نے پکی کل سنانی ہے اور دس کا کچا سبق اس نے تیار کرنا ہے۔ کیوں؟ کل جب وہ آگے جائے گا اور مزید بیس سطروں کی تیاری کرے گا تو پہلی دس سطریں تو کل کچا گزار چکا تھا وہ اس کو بالکل ازبر ہوں گی...... یا جیسے کامیاب حافظ ہوتے ہیں تو وہ ہر روز تراویح کی دو منزلیں نکالتے ہیں ایک آج کی اور ایک کل کی تو اس میں بہت کم امکان ہوتا ہے کہ کل کے دن اٹکن آجائے یا غلطی لگ جائے۔ اس طریقے سے آپ اپنی مقدار مطالعہ ذرا سی بڑھا دیں۔

آخری چیز میں یہ کہوں گا کہ اس دنیا میں رب تعالیٰ نے کامیابی تو محنت میں رکھی ہے لیکن مثالی کامیابی رکھی ہے فدائیت اور فنائیت میں۔ اگر آپ کامیاب مدرس بننا چاہتے ہیں تو محنت کریں۔ اگر مثالی کامیاب مدرس بننا چاہتے ہیں تو آپ اپنے فن پر فدا ہوجائیں۔ اس کے اندر فنا ہوجائیں۔ اس سے عشق مجازی کریں۔ عشق کریں عشق جیسے عاشق کو معشوق کے لیے، اس کا وصال حاصل کرنے میں آنے والی مشقت سے زیادہ لذت کسی چیز میں نہیں آتی۔ اس سبق کی زندگی کے اندر آنے والی مشقتوں سے زیادہ لذت کسی چیز میں جب نہ آنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی عشق کے مشک نے کچھ کچھ ہمارے دماغ کو اپنی جان فزا خوشبو سے معطر کرنا شروع کردیا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

مدارس دینیہ اور عربی زبان کا فروغ

حضرت مولانا نور البشر محمد نور الحق صاحب مدظلہ العالی

الحمد للّٰہ رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد النبی الأمی الأمین، وعلی آلہ واصحابہ وتابعیھم ومن تبعھم باحسان إلی یوم الدین.

میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خالص علمی، دینی اور روحانی مجلس میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب فرمائی۔

اس کے بعد مدرسہ عثمانیہ کے اربابِ انتظام کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں یہ عظیم موقع عطا فرمایا کہ اہل علم کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ساتھ علمی مذاکرہ کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری ان نشستوں کو خالصۃً اپنی رضا کے لئے بنا کر ان کے دور رس اثرات مرتب فرمائے اور ہم سب کو مطلوب مقاصد وفوائد سے بہرہ ور فرمائے۔

اربابِ انتظام نے احقر کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ ہے:

مدارس دینیہ اور عربی زبان کا فروغ:

اس اہم ترین موضوع پر بولنا، اس کا کما حقہ حق ادا کرنا اور موضوع کا تمام جوانب سے احاطہ کرنا، مجھ جیسے ہیچمدان کے بس کی بات تو نہیں، تاہم اکابرین واحباب کے اعتماد پر پورا اترنے کے لئے سب سے پہلے اللہ جل شانہٗ سے مدد طلب کرتا ہوں اور پھر اپنے چند منتشر خیالات کا اظہار کروں گا۔ ان منتشر خیالات کی طرف اس اعتبار سے حضرات اہل علم کی توجہ چاہوں گا کہ یہ ایک طالب علم کے خالص علمی خیالات ہیں ان میں علمی اعتبار سے سقم تو ہوسکتا ہے تاہم یہ باتیں دل کی گہرائیوں سے پیش کی جارہی ہیں۔

عربی زبان کی اہمیت:

سب سے پہلے اصولاً مجھے عربی زبان کی اہمیت اور اس کے مقام پر بیان کرنا چاہیے، تاہم چونکہ یہ

اہلِ علم کی مجلس ہے، ہر شخص اس کی اہمیت اور مقام سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے میں نہایت سرسری انداز سے اس کی طرف اشارہ کروں گا۔

عربی زبان قرآن کریم کی زبان، حضور خاتم النبیین ﷺ کی زبان، عبادت کی زبان اور آپس کے تعلقات وتخاطب کی زبان ہے۔

قرآن کریم اور دین کی زبان ہونے کی حیثیت سے اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ جل شانہٗ نے لے لیا ہے ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے، سورج، چاند اور مریخ کو مسخر کرے یا ثوابت وسیار کے ماوراء کمندیں ڈالے، یہ قرآن ہر مرحلہ اور ہر زمانہ کے لئے اپنی ہدایتوں کی کرنیں بکھیرتا رہے گا، اور جب تک یہ قرآن کریم موجود ہے عربی زبان کی حلاوت وطلاوت، اس کی شوکت، اس کی اثر آفرینی اور اس کی ضیا پاشیاں برقرار رہیں گی۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی آیت: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ کے تحت کتنی خوبصورت اور جامع بات ارشاد فرمائی ہے، ملاحظہ فرمایئے، وہ فرماتے ہیں:

" وذلك لأن لغة العرب أفصح اللغات، وأبينها، وأوسعها، وأكثرها تأدية للمعاني التي تقوم بالنفوس ، فلهذا أنزل أشرف الكتب بأشرف اللغات، على أشرف الرسل، بسفارة أشرف الملائكة، وكان ذلك في أشرف بقاع الأرض، وابتدئ إنزاله في أشرف شهور السنة ، وهو رمضان ، فكمل من كل الوجوه".

پھر چونکہ قرآن کریم اور اس کے ضمن میں عربی زبان کو رہتی دنیا تک کے لئے، قیامت تک آنے والی ہر قوم اور ہر طبقہ کے لئے ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، اس لئے اس کے اندر وہ صوتی، اشتقاقی اور وزن وبناء کی خصوصیات رکھیں، اس کے الفاظ وکلمات اور اس کی تراکیب کو ایسے ممتاز اسلوب، متمیز معانی اور اعلیٰ تاثیر سے موصوف کیا کہ دنیا کی کسی زبان کو یہ تمام خصوصیات وامتیازات یکجا طور پر حاصل نہیں ہیں۔

یہ محض اِدّعا نہیں، بلکہ اس کے پیچھے بحمد اللہ واقعات وشواہد کے بے شمار دلائل ہمارے پاس موجود ہیں، چونکہ اس وقت یہ موضوع نہیں، اس لئے ہم اس سلسلہ میں بس اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

مدارس دینیہ اور عربی زبان:

اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور وہ ہے "مدارس دینیہ اور عربی زبان" اس پر بات آگے بڑھانے سے پہلے میں اپنے معزز سامعین کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ برصغیر میں ہمارے دینی مدارس کے انشاء و وجود کی ایک تاریخ ہے. اس تاریخ کے بغیر شاید ہم عربی زبان کے حوالے سے واضح بات نہ کرسکیں۔

تمام اہل علم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ یوں تو مشائخ سے تعلق، اور درس گاہوں اور مساجد کے اندر استادوں کے سامنے شاگردوں کا زانوئے تلمذتہ کرنا کوئی ایک آدھ صدی کی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے بلکہ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ہمارا یہ سلسلۂ تعلیمی نسب "صفہ" تک جا پہنچتا ہے۔ تاہم ہمارا قریب ترین تعلق برصغیر سے ہے اور برصغیر میں بھی ہندوستان کے ایک قصبہ "دیوبند" سے ہے، ہندوستان بلکہ برصغیر کے تمام اہل حق کے ادارے مدرسہ عربیہ دیوبند یا مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے جا ملتے ہیں، ان دونوں مدارس کا وجود کن حالات میں ہوا؟ اس سے اہل علم اچھی طرح واقف ہیں کہ اکابرینِ دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی سیاسی وعسکری پسپائی کے بعد مسلمانوں کی یکجہتی اور ان کے ایمان کی حفاظت کے واسطے ضروری سمجھا کہ اس قسم کے ادارے وجود میں آئیں، ان اداروں کا مقصد مسلمانوں کے دین کی حفاظت، عقیدہ کی حفاظت اور ان کے تشخص کی حفاظت تھا۔ الحمدللہ! آج پوری دنیا گواہ ہے کہ اکابرین دیوبند نے ان اداروں کے ذریعے اللہ تعالی کے فضل سے لوگوں کے ایمان کی نہ صرف حفاظت کی، بلکہ ان کے اندر اپنے مسلمان ہونے کا اعتزاز پیدا کیا۔

یہیں سے ان کوتاہ بینوں کی یہ بات بے بنیاد ہو کر رہ جاتی ہے کہ اہل مدارس اپنے اداروں کو "مدارس عربیہ" کا نام دیتے ہیں لیکن ان مدارس میں عربی بول چال جاننے والے کیوں نہیں؟

درحقیقت ان مدارس کا وجود "عربی زبان" بحیثیت زبان کے سکھانے کے لئے نہیں ہوا تھا، بلکہ ان مدارس نے ٹھیٹھ دینی علوم کی حفاظت کی ہے، اور ان علوم کے ذریعہ لوگوں کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کی ہے۔

جہاں تک عربی زبان کے ضروری حد تک حاصل کرنے کا تعلق ہے سو اس سے اہل مدارس بھی

غافل نہیں رہے۔ چنانچہ حضرات علماءِ دیوبند کی عربی تصنیفات اس پر شاہد عدل ہیں، جن میں قدماء کی پختگی ورسوخ اور اہل عصر کا ذوق ووجدان مکمل طور پر دستیاب ہے۔ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کی ''فیض الباری'' حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ''بذل المجہود'' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''فتح الملہم'' شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ کی ''اوجز المسالک'' حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ''معارف السنن'' اور اس طرح دسیوں بیسیوں نہیں، بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں ان مدارس کے ابناء کی عربیت دانی اور ان کے اعلیٰ ذوق کی بیّن دلیل ہیں۔

اس میں کسی قسم کے شک کی بات نہیں کہ دیوبند وسہارنپور نے عربی زبان کو بحیثیت علمی زبان کے استعمال تو کیا، تاہم اس کو مقصدِ اصلی قرار دے کر اولیت نہیں دی۔ جبکہ ان کے معاصر بعض دیگر اداروں میں اس کو اولیت تو دی گئی لیکن دیگر علوم جو اصل مقصود تھے ان کے اندر خامی پیدا ہوگئی۔

ہمارے زمانہ میں عربی زبان کی اہمیت:

یہ میں نے آپ کے سامنے اپنے اکابرین کے اُس زمانے کی بات رکھی ہے، تاکہ ذہن سے یہ بات محو ہوسکے کہ ہمارے اکابرین نے عربی زبان کو دیگر بعض معاصر اداروں کی طرح اہمیت کیوں نہیں دی؟

جہاں تک آج کے زمانہ کا تعلق ہے، سو یہ بات شاید ہی کسی سے مخفی ہو کہ آج کے زمانہ اور ہمارے اکابرین کے کل کے زمانہ کے درمیان زمین وآسمان کا فرق آگیا ہے۔

آج دنیا جس طرح سمٹ کر یکجا ہوگئی ہے مشرق ومغرب کے فاصلے سمٹ گئے ہیں پل پل کی خبریں براہ راست دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ رہی ہیں، اس کا تصور ہمارے ان بزرگوں کے زمانہ میں نہیں تھا۔

انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اگر ''نادی الأدب'' کی بنیاد ڈالی تھی تو صرف اتنی بات کے لئے کہ اپنے ''تراث'' کی حفاظت ہوسکے، قدماء عرب اور شعراء اسلام کی محاکات ہوسکے۔

جبکہ آج ہم سیاسی، سماجی، معاشرتی، دفاعی، ہر ہر میدان میں مجبور ہوگئے ہیں کہ اہل اسلام کا دفاع کریں، اغیار کی یلغار کو روکیں، ''غزو فکری'' کے عنوان سے ہمارے اوپر جو جنگ مسلط ہے اس

میں بھر پور کردار ادا کریں، اور یہ اقدامی یا دفاعی کردار بغیر ایک مؤثر زبان کے، بغیر ایک مؤثر قلم کے ادا کرنا ممکن نہیں۔

یہ مؤثر زبان کیا ہو؟ یہ مؤثر قلم کون سا ہو؟ اس سلسلے میں کسی ایسے شخص کا اختلاف ہرگز نہیں ہوسکتا جس کے اندر اسلام کا کچھ بھی شمہ ہو یا اپنے مسلمان ہونے اور نبی عربی کا امتی ہونے کا ذرا بھی احساس ہو، کہ یہ زبان سوائے عربی کے اور کوئی زبان ہو نہیں سکتی۔

عصر حاضر میں صحرائے عرب میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے جو زرِ سیال کے ابلتے ہوئے چشمے نمودار ہوئے ہیں، انہوں نے عالمِ عرب کا مقام کہیں سے کہیں پہنچا دیا، آج حال یہ ہے کہ روس، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی جیسے دشمنان اسلام بھی اپنے اقتصادی وسیاسی مفادات ومصالح کی خاطر اہل عرب کے بادیہ نشینوں کی خوشامد اور عربی زبان سیکھنے اور بولنے پر مجبور ہوگئے ہیں، اسی لئے تمام یورپین ممالک کے لئے عربی زبان وادب کی درس گاہیں کھولنا اور ان کو فروغ دینا ناگزیر ہوگیا ہے۔

آج ان ممالک کو عربی دان اساتذہ کی ضرورت ہے۔ جدید علوم وفنون کے عربی دان ماہرین کی ضرورت ہے، عربی دان ڈاکٹروں اور انجینیروں کی ضرورت ہے، اقتصادیات وتجارت کے ماہرین کی حاجت ہے۔

اگر ہم اس صورت حال پر غور کر کے عربی زبان کی اہمیت کو سمجھتے اور عربی زبان وادب کو بحیثیت لازمی مضمون کے حاصل کر کے افراد کی فراہمی کرتے تو آج عالم عرب پر منڈلاتے سارے گدھ چھٹ جاتے۔ جو خطرات آج عالم عرب پر اور پھر عالم اسلام پر منڈلا رہے ہیں ان کا دور دور تک نام ونشان تک نہ ہوتا۔

الحمد للہ! ہندوستان وپاکستان کے مدارسِ دینیہ نے ان حقیقت کا بھر پور ادراک کیا دار العلوم دیوبند نے تو اس سلسلہ میں قائدانہ کردار ادا کیا، حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں دار العلوم دیوبند کے پلیٹ فارم سے یہ کوشش شروع کی، اور بفضلہ تعالیٰ اسے بامِ عروج تک پہنچایا، اور ماشاء اللہ انہوں نے ایک قابلِ قدر جماعت ایسی پیدا کردی جس کی شبانہ روز کوششیں تاحال عربی زبان کے فروغ وتطویر کے لئے جاری وساری ہیں۔

پاکستان کے مدارس میں اگرچہ اس طرح کی بھر پور کوشش پہلے شروع نہیں ہوسکی۔ لیکن مفتی اعظم

پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابرین نے اپنے زمانہ میں بحمد اللہ بعض عرب علماء کے ساتھ مل کر عربی زبان کو فروغ دینے کا کام شروع کردیا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماشاء اللہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی اور پھر جامعہ دارالعلوم کراچی میں عربی کی باقاعدہ ایسی درس گاہیں وجود میں آگئیں جن کی تدریسی وتعلیمی زبان ہی عربی قرار پائی۔

آج سے چند سال پیشتر تک حال یہ تھا کہ مدارس میں عربی بول چال کی کیفیت واجبی تھی، خال خال کوئی عربی بولنے والا اور لکھنے والا ملتا تھا، اور اگر کوئی ایسا طالب علم مل جاتا اسے ماورائی مخلوق کا درجہ حاصل ہوجاتا تھا۔ اب الحمد للہ! صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ان مدارس میں نہ صرف یہ کہ عربی بول چال والے بکثرت پیدا ہوگئے ہیں بلکہ الحمد للہ! ہمارے درمیان ایسے طلبہ کی کمی نہیں جو فی البدیہ ارتجالاً عربی میں خطاب کرسکتے ہیں اور بلیغ خطبے دے سکتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میں جامعہ دارالعلوم کراچی میں ابتدائی مدرس لگا تھا، ایک طالب علم کا درجہ ثالثہ میں داخلہ ہوا، اس کی کیفیت یہ تھی کہ جب اس سے پوچھا جاتا ''ما اسمک؟'' وہ کہتا ''اسمک فلان'' لیکن جب اسے عربی کی ترغیب دی گئی، عربی نادی میں اسے شرکت کا موقع ملا، تو سال گزرنے نہیں پایا تھا کہ وہ عربی کا فی البدیہ خطیب بن چکا تھا۔

یہ صرف ایک مثال نہیں بلکہ اس کی دسیوں مثالیں میرے سامنے موجود ہیں۔ ایک طالب علم نے میٹرک پاس کرکے درجۂ اولیٰ میں داخلہ لیا، عربی سے ذرّہ برابر کوئی واقفیت نہیں تھی، لیکن چند مہینوں کی دلچسپی سے یہ طالب علم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کے صحیفۂ جداریہ نکالنے لگا اور سالانہ امتحان میں عربی میں پرچے حل کرنے کے قابل ہوگیا۔

اور الحمد للہ! اب تو یہ سلسلہ ایسا چل پڑا ہے کہ عرب علماء آکر محسوس کرتے ہیں کہ ہم عجمیوں میں نہیں، خالص عرب ماحول میں ہیں، ولله الحمد اولاً وآخراً۔

اس وقت تقریباً تمام قابلِ ذکر مدارس میں عربی کی مخصوص درسگاہیں ''معهد اللغة العربية'' کے نام سے یا ''القسم العربی'' کے نام سے وجود میں آچکی ہیں۔ بعض اداروں میں ''**تخصص فی اللغة والادب**'' کا اجراء ہوچکا ہے۔

جامعہ فاروقیہ سے مجلہ ''الفاروق'' عربی ایک عرصہ دراز سے عربی کے فروغ میں کردار ادا کر رہا ہے۔

اسی طرح جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے ''البینات'' کے نام سے عربی مجلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔

جامعہ دارالعلوم کراچی سے بھی عنقریب عربی مجلہ البلاغ کے صدور کی نوید مل رہی ہے۔

ان مدارس میں اور دیگر مدارس میں طلبہ کی صحت مند سرگرمیوں میں عربی کی نشاطات کافی ہیں، ہر ادارہ میں طلبہ ہفتہ وار، ماہوار مجلات وصحف جداریہ نکال کر اپنے ذوق کو پروان چڑھا رہے ہیں۔

ہمارے کراچی میں مدرسہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اس سے ملحق مدرسہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اس سلسلہ میں کردار آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، کہ ماشاء اللہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے لے کر بڑے بڑے طلبہ وطالبات تک، دفتری زبان سے لے کر مطبخ اور باورچی خانہ تک عربی زبان ہی رائج ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے کراچی کی ایک معروف علمی شخصیت مفتی ابولبابہ صاحب اور ان کے ساتھ مدرسہ ابن عباس کے شیخ موسیٰ صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں جو وہ ملک کے طول وعرض میں انجام دے رہے ہیں۔

پھر ہمارے دوست استاذِ ادب وحدیث مولانا ولی خان المظفر صاحب اور ان کے جوان رفقاء کی خدمات بھی انتہائی قابلِ قدر ہیں جو وہ سر انجام دے رہے ہیں۔ اور شب وروز اس سلسلہ میں کوشاں ہیں۔

میں یہاں اپنے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا تو احاطہ نہیں کرسکتا جو عربی زبان کے فروغ کے سلسلہ میں کوشش کر رہے ہیں، البتہ صرف ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر ان کے ذکر کو میں نے ضروری سمجھا ہے۔

کیا عربی کے فروغ کے لئے اسی قدر محنت کافی ہے؟

یہ کوششیں جو میں نے گوش گزار کیں، کیا عربی زبان کے فروغ اور مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لئے یہی کافی ہیں؟ یا اس سلسلے میں مزید اقدام کی ضرورت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اب تک جو کوششیں ہوئیں وہ اپنی جگہ نہایت قابلِ قدر سہی، لیکن ابھی اس

سلسلہ میں مزید محنت اور اقدام کی حد سے زیادہ ضرورت ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے کئی تحدیات (چیلنجز) ہیں جن کے مقابلے کی ضرورت ہے۔

(۱)......ایک طرف عربی زبان کی عالمگیریت، اہمیت، فضائل ومناقب اور ہمہ گیریت ہے، دوسری طرف انگریزوں اور یورپین ممالک کی سرگرمیاں ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ عربی زبان کے اندر الحمدللہ! ہر جدت کو ہضم کرنے کی صلاحیت موجود ہے، جدید سے جدید اصطلاح کو عربی کے سانچہ میں ڈھالنے کی قوت موجود ہے۔ اس کے باوجود عالمِ عرب کے اتنے ممالک اوران کی افرادی قوت کے ہوتے ہوئے، نیز عالم اسلام جس کا دینی اور جذباتی لگاؤ عربی زبان سے ہے، اس کے باوجود انگریزوں نے اپنی شاطری اور ہوشیاری کے ذریعہ اور مسلمانوں کے تعیش میں پڑنے کی وجہ سے یہ برسرزمین حقیقت اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ انگریزی کا جادو پوری دنیا پر سرچڑھ کے بول رہا ہے۔

آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان صرف انگریزی سمجھی جاتی ہے، انٹرنیٹ کی بنیادی زبان آج تک عربی میں رائج نہیں ہوسکی۔

یہ خدانخواستہ عربی زبان کی اپنی خامی یا کوتاہی ہرگز نہیں، البتہ عربی زبان بولنے والوں اور اس کی طرف انتماء وانتساب رکھنے والوں کی کوتاہی ہے۔

ایسے موقع پر مجھے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یاد آتا ہے جوانہوں نے امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ امام لیث مرتبہ ومقام اور علمیت کے اعتبار سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے تاہم امام مالک کوایسے شاگرد میسر ہوئے کہ انہوں نے ان کو اوجِ ثریا پر پہنچادیا، جبکہ امام لیث بن سعد کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہوسکی۔

بعینہٖ یہی صورت حال آج انگریزی اور عربی زبانوں کے ساتھ ہے، انگریزی کو باوجود اس کی ہزار خامیوں کے رواج دینے والے اور خدمت کرنے والے ایسے میسر آئے کہ اس کی نظیر نہیں، جبکہ حالیہ زمانے کے لحاظ سے عربی کی جس طرح خدمت کرنی چاہیے تھی وہ خدمت نہیں ہوئی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے اندر ہم دینی تحمس پیدا کرکے، ایک مشن سمجھ کر عربی زبان وادب کو فروغ دیں اور یہ ثابت کردیں کہ جس طرح دنیا کے بہت سے ممالک اپنے یہاں انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے ہمیں بھی عربی زبان کے مقابلے میں انگریزی سمیت کسی بھی عجمی

زبان کی ضرورت نہیں۔ اس تحسس کے ساتھ پھر ہمہ جہتی اقدام کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اصل کردار تو حکومتیں ادا کرسکتی ہیں، لیکن یہ کیا ایک حقیقت نہیں کہ علماءِ دین اور اصحابِ مدارس نے کبھی بھی کسی دینی کام کو حکومت پر تکیہ کرتے ہوئے چھوڑے رکھا ہو؟ ایسا کبھی نہیں ہوا، بلکہ اپنی بساط بھر کوشش، انفرادی واجتماعی طور پر وہ کرتے رہے ہیں۔ یہاں بھی اس طرح کی کوششوں کی ضرورت ہے۔

اس کے فروغ کے سلسلے کو اگر ہم اپنے پاس آنے والے طلبہ وطالبات تک محدود نہ رکھیں، بلکہ ہم اپنے ان مسلمان بھائیوں اور بہنوں تک بھی پہنچاسکیں جو ہمارے پاس نہیں آتے، تو یہ ایک نہایت مؤثر اقدام ہوگا۔

اس کی اہمیت اس طرح اور بڑھ جاتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں انگریزی خواں طبقہ کی بہتات ہے، انگریزی بحیثیت ایک زبان کے بالکل معصوم سہی، اس کے اثرات کے لحاظ سے اسے معصوم ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا، اس زبان کے بارے میں ہمارے اکابرین کے سخت اقوال اس کی اسی بری اثر آفرینی کی وجہ سے ہیں۔

انگریزوں کے ممالک کی یاترا، انگریزی جرائد ومجلات کی بھرمار، انگریزوں کی بود وباش، یہ ساری چیزیں ہمارے طبقہ اشرافیہ پر اثر انداز ہیں، جبکہ یہ بات بھی مبنی برحقیقت ہے کہ اگر عربی زبان کو فروغ دیا جائے اور ایسے طبقوں کے اندر عربی زبان رائج ہوجائے تو اس کے لاشعوری طور پر بھی اثرات ظاہر ہوں گے۔

اس کی بعینہٖ مثال وہی ہے جو "صحبت صالح وصحبت طالح" کی مثال حدیث شریف میں دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص عطار کے پاس بیٹھ جائے، چاہے وہ عطر اور خوشبو نہ بھی لگائے تب بھی وہ اس سے مستفید ضرور ہوتا ہے، جبکہ وہ شخص کسی لوہار کے پاس بیٹھتا ہے وہ اگرچہ آگ کی وجہ سے نہ جھلسے تاہم اس کے دھویں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس وقت ضرورت ہے کہ اہل مدارس اپنے مدرسوں کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں عربی کے فروغ کے لئے باقاعدہ مراکز کھولیں، جس طرح اور جس انداز میں انگریزی کو پھیلایا جارہا ہے اسی طرح اور اسی انداز میں، مگر جائز حدود میں رہتے ہوئے، عربی کے فروغ کی کوشش کی جائے۔

یہ عربی کے فروغ کی کوشش لوگوں کو دین کے قریب لائے گی، قرآن کریم کے قریب لائے گی، عبادت کے قریب لائے گی اور معاشرے میں اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

دنیادار طبقہ دین کو معاذ اللہ فائدہ مند نہیں سمجھتا، تاہم وہ عربی زبان کے فوائد اور اس کے سیاسی واقتصادی مفادات ومصالح سے ضرور واقف ہے، اس لئے عربی زبان کے بہانے وہ دین سے قریب تر ہو جائے گا۔

(۲)......اس وقت پورے عالم کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ مادہ، مادیات اور دنیا کی چکا چوند اور خیرہ کردینے والی رونقیں ہیں، ہر شخص کے پیش نظر مال ودولت اور کمالیات کا حصول ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں اسلامی نقطۂ نگاہ سے سمِ قاتل ہیں۔

دنیا والوں کو اس ورطہ سے نکالنے کے لئے ہمارے پاس قرآن کریم اور حضور ﷺ کی سیرت کا طلسماتی نسخہ موجود ہے۔

ہماری نالائقی اور سستی کی وجہ سے قرآن کریم پر ہاتھ صاف کرنے والے آج وہ لوگ ہیں جنہوں نے انگریزوں کے پاپوش کی صفائی میں اپنی زندگیاں بتادیں، نتیجہ یہ کہ انگریزوں اور دیگر اقوامِ عالم کے سامنے نہ تو قرآن کریم کے معانی ومفاہیم صحیح اور درست انداز میں پہنچ پارہے ہیں اور نہ ہی حضور اکرم ﷺ کی سیرت اور آپ کا اُسوۂ حسنہ اس کے اصلی روپ میں پہنچ پارہا ہے۔

ہدایت کے ان دونوں سرچشموں کو ان کی اصلی ہیئت میں پہنچانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ اس کی اولین ذمہ داری اولوالامر اور اصحابِ اقتدار پر ہے۔ لیکن آج جن کو انگریزوں کی کاسہ لیسی سے فرصت نہیں وہ کب اس ذمہ داری کو اٹھاسکتے ہیں؟!۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری بھی حضراتِ علماء اور اصحابِ مدارس کے کاندھوں پر ہے جو اس دین کے اصل رکھوالے اور پہرے دار ہیں۔

آج پوری دنیا میں شور ہے کہ فلاں ملک نے گستاخ خاکے شائع کیے ہیں اور فلاں فلاں ممالک گستاخی کے مرتکب ہیں، اس کے لئے ہم ہزار بائیکاٹ کا علاج سوچتے ہیں، لیکن ہمارا ایسا کوئی علاج کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا علاج سوائے اس کے کیا ہے کہ ہم حضور ﷺ کی سیرت کو ان دریدہ دہنوں کے سامنے اپنی اصل شکل وہیئت کے ساتھ پہنچاسکیں، حضور ﷺ کی سیرت اپنے آپ کو

خود منوائے گی اور ''وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ'' کا مظہر عالم پر آشکار ہو کر رہے گا۔

اور یہ بات تو مسلّم ہے کہ عربی زبان میں جس قدر سیرت نگاری کا کام ہے کسی بھی زبان میں نہیں ہے۔

(۳)...... مدارس کے پیش نظر ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ آج دینی مدارس اور پختہ کار علماء کے اشراف وسرپرستی کے بغیر اپنی ذاتی ذہانت وفطانت کے بل بوتے پر یا عالم عرب کے کاروباری وسیاسی چکر لگا کر بہت سے طالع آزما عربی دانی کے منصب پر فائز ہو جاتے ہیں، ایسے لوگ دین سے بے بہرہ ہونے اور ملاحدہ کی صحبت ومعاشرت کے پلے ہوئے ہونے کی وجہ سے عربی زبان میں وہ زہر اگلتے ہیں کہ الأمان والحفیظ!! دین کے مسلّمات مشکوک قرار پاتے ہیں اور ہمارا دنیا دار طبقہ دین کے واسطے ایسے لوگوں کو اتھارٹی سمجھنے لگتا ہے۔

جب تک کسی علم کو دین کے دائرہ میں رکھ کر حاصل نہ کیا جائے تو ایسے علوم گمراہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

آج ہمارے ملک میں ایسے کئی افراد مشہور ہیں جن کی علمی حالت قابلِ رحم ہے اور وہ شیخ التفسیر والقرآن بنے ہوئے ہیں، مال دار طبقہ کو متاثر کرنے کے لئے بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال اور عربی دانی کا اظہار کافی سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ان سے تفسیر کی کس قسم کی خدمت ہوگی! وہ اہل علم پر مخفی نہیں۔

اس قسم کے لوگوں میں بعض وہ بزعم خود علامہ بھی ہیں جو ٹی وی چینلوں کے ذریعہ ''تعلیم یافتہ'' طبقہ کے لئے سند بن کر نازل ہوتے اور دین کے مسلّمات کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ عربی زبان بحیثیت ایک زبان کے اس کے اندر جہاں رشد وہدایت کی بے شمار راہیں ہیں، وہاں یہ گمراہی وضلالت کا بھی زبردست ذریعہ ہے ''یضل به کثیراً ویهدی به کثیراً'' تو قرآن کریم کا وصف بھی ہے۔

جب تک ہم عربی زبان کی تحصیل اور اس کی مہارت کو دینی اطار اور فریم کے اندر نہیں لاتے، اس وقت تک یہ ہمارے لئے رحمت کے بجائے زحمت ہے اور زبردست وبال ہے ایسی صورت میں ہمارے معاشرے میں دین کے نام پر بے دینی پھیلانے والے ظاہر ہوتے رہیں گے۔

ہاں! اس کو دین کے تابع کر کے استعمال کیا جائے، تو پھر رشد وہدایت کا ایسا زبردست ذریعہ ہے کہ اس سے چاردانگ عالم روشن ہو جائے۔

مدارس اور اہل مدارس جہاں اس ملک کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ کہلاتے ہیں یہی عربی زبان کی صحیح حفاظت اور عربی کے راستے سے نمودار ہونے والی ضلالت کا صحیح مقابلہ کر سکتے ہیں۔

عربی زبان کے فروغ کے لئے چند تجاویز:

اہل مدارس کو کن جہات سے کوششیں کرنی چاہئے؟

احقر کے ناقص خیال میں اس محنت کو کم از کم دو حصوں میں منقسم کرنا چاہئے۔

ایک محنت مدارس میں آنے والے طلبہ وطالبات پر۔

دوسری محنت عام لوگوں پر۔

عام لوگوں پر محنت:

جہاں تک عام لوگوں پر محنت کا تعلق ہے، سو ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل مدارس ان کے لئے مختلف سینٹروں کا افتتاح کریں، ان میں درس قرآن کے ساتھ ساتھ بنیادی عربی کی تعلیم اور بول چال کی مشق کرائی جائے۔

اس طرح ان لوگوں کا ربط ضبط علماء سے ہوگا اور بہت سارے فتنوں کا سدِ باب ہوگا۔ ساتھ ساتھ ہمارے تاجر طبقے کے اندر عالمِ عرب کے ساتھ تجارتی تعلقات فروغ پائیں گے۔

طلبہ وطالبات پر محنت:

دوسری محنت جو طلبہ وطالبات پر کرنے کی ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ

۱۔ ہم لوگ ''الطريقة العصرية'' سے لے کر ''ديوان الحماسة'' تک مختلف ادب وانشاء کی کتابیں پڑھاتے ہیں، بہت ہی معذرت کے ساتھ گزارش کی جاتی ہے کہ ادب کی کتابیں پڑھانے کا طرز اور طریقہ بدلنے کی ضرورت ہے۔

ادب کی کتاب کو محض نحو اور صرف کی کتاب بنا دینا، اس کے مقصد کو محو کر دینا ہے۔

آج بیشتر مدارس میں جہاں مستقل عربی کی درس گاہیں نہ سہی، عربی ادب کی چھوٹی بڑی کتابیں تو پڑھائی جاتی ہیں لیکن ان کو صرف اور نحو کا ملغوبہ بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔

''ادب'' کی کتاب کا اثر طلبہ وطالبات پر بھی پڑے، زندگی کی زندہ مثالیں پیش کی جائیں،

متنوع مثالوں کے ذریعہ اجرا کر کے مشق کرائی جائے، فروقِ لغویہ کی طرف خاطر خواہ توجہ دی جائے، اسلوبِ نگارش پر تبصرہ ہو، محاورات اور ضرب الامثال کے معانی ومحامل کی تعیین ہو، یہ انداز ناپید ہے۔

جبکہ ادب کی کتابیں "**الكامل**" **للمبرد** "**الأمالي**" **لأبي علي القاري** "**العقد الفريد**" **لابن عبدربه** "**البيان والتبيين**" **للجاحظ** "**شرح المقامات**" **للشريشي** پر سرسری نظر ڈالی جائے، تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ ادب کیا چیز ہے؟ اس میں کس چیز پر ترکیز کی گئی ہے۔

روایتی انداز اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عربی ادب وانشاء کی کوئی بھی کتاب ابھی وجود میں آتی ہی ہے کہ اس کی کلید، حل اور شرح کے نام سے کتاب وجود میں آجاتی ہے، ابداعی طبیعت نہ ہونے اور مدارس کے اندر صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے یہی "مفتاح" مدار بن کر رہ جاتی ہے، اس طرح صلاحیتوں کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں۔

اگر ہم ادب وانشاء کی کتابوں کو مخصوص طرز وانداز اور مخصوص مثالوں کی قید سے آزاد کر کے کام کریں تو کوئی "مفتاح" وجود میں نہ آئے۔

میں مفتاحوں اور شروحات کی افادیت کا انکار نہیں کر رہا، تاہم ان کے اس ضرررساں پہلو کی طرف متوجہ کر رہا ہوں۔

۲۔ الحمدللہ! ہمارے بہت سے مدارس میں عربی کی باقاعدہ درس گاہیں وجود میں آچکی ہیں بلکہ بعض بعض مدارس میں تو کامل مکمل عربی زبان ہی میں تدریس ہورہی ہے، یہ ایک صحت مند رجحان ہے۔ تاہم اب تک ہمارے بیشتر مدارس میں عربی زبان کی تدریس کا مستقل انتظام نہیں ہے۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

پھر جن مدارس میں "معہد" یا "القسم العربي" کا شعبہ موجود ہے ان میں ایک رجحان یہ بھی چل رہا ہے کہ بسا اوقات اس میں عربی کے بجائے اردو استعمال کی جارہی ہے۔ اور پورا سبق اردو میں ہورہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ انتہائی افسوس ناک ہے!

اس طرح کے رجحانات کی کیا وجوہات ہیں؟ ان وجوہ کا معلوم کرنا اور ان کا تدارک کرنا اربابِ اہتمام وانتظام کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ یہاں ان جزئیات کا ذکر مناسب بھی نہیں اور ممکن بھی نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ عربی کی تدریس کے لئے غیر معمولی صلاحیت کے حامل اور اس زبان سے دلچسپی رکھنے والے اہل افراد کی تعیین ہونی چاہئے جو مشن سمجھ کر اور عشق کے جذبہ کے ساتھ کام کریں۔

۳۔ ہر ادارہ میں کم از کم ایک کمرہ یا لائبریری ایسی ہو جس میں اہم اور ضروری کتابیں ہوں اور عالمِ عرب سے شائع ہونے والے اخبارات وجرائد اور مجلات مہیا ہوں۔

انٹرنیٹ کی موجودگی نے اب یہ کام انتہائی آسان کر دیا ہے، آج عالمِ عرب کا کوئی قابلِ ذکر رسالہ یا اخبار ایسا نہیں جو ''نیٹ'' پر موجود نہ ہو، ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ ہمارے زمانے میں انٹرنیٹ کا جو نفوذ ہو رہا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، اور یہ دو دھاری تلوار ہے، اگر اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو سالوں کی محنت دنوں اور گھنٹوں میں سمٹ آتی ہے۔ اگر اہل مدارس اس کا صحیح طور پر استعمال کریں تو اس کی افادیت بہت زیادہ پھیل سکتی ہے، اب تو بہت سے مدرسوں کی باقاعدہ سائٹس وجود میں آچکی ہیں۔

اگر ہم ان سائٹس میں عرب سائٹس کی طرح ''منتدیات'' کا سلسلہ شروع کریں تو افادہ واستفادہ کا ایک بڑا راستہ کھل جائے گا۔

نیز اس کے ذریعہ ہم عربی زبان کے لہجہ اور اسلوب کو براہ راست عرب علماء وشیوخ کے محاضرات کے ذریعہ سیکھ سکتے ہیں۔

جس طرح آج ہم اہل مدارس طلبہ وطالبات کو موبائلوں کے استعمال سے نہیں روک سکتے، اسی طرح ہم انٹرنیٹ کے استعمال سے روکنے پر بھی قادر نہیں، سو بجائے اس کے کہ طلبہ وطالبات فضول چیٹنگ اور دین ودنیا کو برباد کرنے والی مشغولیات میں مبتلا ہوں ان کو صحت مند رجحان کیوں نہ فراہم کردیں؟

آخر میں اتنی بات عرض کر کے ختم کرتا ہوں کہ:

اصل بنیادی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے کتابی ونشری وسائل نہیں بلکہ ''زندہ انسان'' کی ضرورت ہے، جس کے اندر زندگی متحرک ہو، زمانہ کی چال سمجھتا ہو، سرد وگرم چشیدہ ہو، لغت واسلوب

عرب سے واقف ہو، ایسے مردِ باکمال کے ذریعہ مردہ قوم کے اندر جان پڑ سکتی ہے۔ اور حیویت ومعنویت وجود میں آسکتی ہے، اس کی کوششیں جاری رکھی جائیں۔

آخر میں اپنی اس طویل سمع خراشی پر تمام حضرات سے معذرت خواہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ ان باتوں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور افادہ واستفادہ کا ذریعہ بنائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

☆......☆......☆

بسم الله الرحمن الرحيم

فضيلة الشيخ موسى العراقي أدام الله مجده

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على خاتم الأنبياء والمرسلين، يقول الله تبارك وتعالى: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ (يوسف:٢) ويقول جل جلاله: ﴿إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ (الزخرف:٣) ويقول عزَّ من قال: ﴿وَكَذَلِكَ أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْراً﴾ (طـــه:١١٣) وللعلماء أقوال في قوله تعالىٰ لعلكم تعقلون.

فكلمة "لَعَلَّ" إذا جاءت في كتاب الله تعالى فإن المراد منها الترجي، ولكن الترجي لا يكون لله تعالى، إنما يكون للمخاطب أي رجاء منكم أن تعقلوا، أو يكون معناها بمعنى "كي" أي كي تعقلوا - والله أعلم -.

وعلى كلا المعنيين يتضح لنا أن كون القرآن عربيا رجاء للتعقل ولم يكن القرآن منزلا للعرب فحسب بل لكل مسلم، وعلى هذا من أراد أن يرجو العقل الذي يوصل إليه القرآن فلا سبيل له إلا أن يتعلم العربية، وبها يقوى عقله ويتأصل فهمه لكتاب الله تعالى، ولكن أيةَ عربية يجب أن يتعلمها ليزداد عقله؟ العربية التي نزل بها القرآن، وتحدث بها محمد ﷺ والصحابة لا اللهجات التي لا قاعدة فيها ولا ضابطة.

ولا غر أن تكون العربية مقوية للعقل؛ فإن كثرة قواعدها وضوابطها تجعل الناطق بها فطنا في كل كلمة يخرجها من فيه.

هذا إذا أراد الفصاحة والابتعاد عن اللحن وكثرة حضور الذهن عند التكلم خشية الوقوع فيلحن، أو تركيب خاطئ تورث المتكلم حدة في قريحته وتشحذ دماغه كما أن كثرة القواعد تعقِل اللسان من أن يتلفظ بما يشاء بل

تلزمه بمتلفظات خاصة لا يجوز أن يخرج عنها، وقد أخرج البيهقي في شعب الإيمان عن عمر بن الخطاب ﷺ أنه قال: تعلموا العربية فإنها تثبت العقل وتزيد في المروءة.

ولا حرج إن قلنا: إن العربية تقوى العقل؛ فإن الأدب والبلاغة والمعاني التي تحملها العربية في طياتها تجعل المتكلم بها يقظا مستجمعا جميع القواعد، وهذا بلا ريب يرفع من سليقة الإنسان ويحدها. وكذلك تورث الإنسان قوة التعقل والابتعاد عما لا يليق من التصرفات، ولهذا اشتهر العرب وهم في الجاهلية بحسن الأخلاق بل كانوا يعظمون الأخلاق تعظيما لم يسبقهم أحد إليه. وعندما جاء الإسلام زادهم خلقا وحسن تصرف، ولهذا قال عليه الصلاة والسلام: "خياركم في الجاهلية خياركم في الإسلام إذا فقهوا".

وعندما كان العرب ينطِقون بلغة قد بلغ الغاية في الفصاحة والبلاغة تولدت عندهم قدرات عقلية قد تفوق التصور فقد نشأ عندهم ما يسمى بفن القيافة، وهذا الفن كاد أن يكون سحرا ولم يعرف من قبل ولا من بعد، وهو فن قد انتشر بعد ما دخلت الفصاحة والبلاغة عند العرب، وكان أحدهم إذا رأى أحداً نسبَه إلى أبيه الحقيقي. وما قصة أسامة بن زيد مع أبيه زيد بن حارثة ببعيدة عن الجميع.

فقد روى البخاري من حديث عائشة رضي الله عنها قالت: دخل علي رسول الله ﷺ ذات يوم وهو مسرور، فقال: يا عائشة! ألم تري أن مجززاً المُدلجي دخل فرأى أسامة وزيداً وعليهما قطيفة قد غطيا رؤوسهما، وبدت أقدامهما، فقال: إنَّ هذه الأقدام بعضها من بعض. ثم عندما اندثرت الفصاحة والبلاغة اللتان كانتا ديدن العرب في الكلام اندثرت معهما تلك القدرات، ومنها فن القيافة، واندثرت معها كثير من الأخلاق التي كانت من

ميزة العربِ وخصوصيتهم. وقد أدرك الصحابة رضي الله عنهم هذه المزية في العربية، فأوصوا بها ودعوا إليها فكانوا لا يفتح الله عليهم بلدا إلا وأدخلوا عليه العربية بعد دين الإسلام.

ومما تجدر الإشارة إليه هو أن الناطق بالعربية تنشط حافظته وتتوسع حتى أنه قد يحفظ من السماع الأول، فها هم صحابة محمد عليه الصلاة والسلام يحفظون حديثه من السماع الأول مهما طال بل قد يروي أحدهم حديثا سمعه مرة من النبي عليه الصلاة والسلام بعد سنين ولم ينقص منه حرفا واحدا، وقد يحفظ أحدهم السورة من السماع الأول فقد ذكر أنَّ أحدَ الصحابة كان راكبا دابته ويقرأ سورة البقرة وقد تبعه أعرابي من غير أن يعلم به الصحابي فما أن انتهى من قراءة سورة البقرة إلا وقال له ذلك الأعرابي: من أين لك هذا الشعر يا هذا؟ فالتفت إليه الصحابي، وقال له: أي شعر هذا؟ فقال: هذا الذي قرأته قبل قليل، فقال: أو سمعته؟ قال: نعم سمعته وحفظته وبدأ بقراءة سورة البقرة حتى انتهى منها، فقال له الصحابي: ليس هذا شعرا إنما هو كلام الرحمن فأسلم الأعرابي في حينها، فهذا الأعرابي قد حفظ سورة البقرة من السماع الأول، ولا غرابة في ذلك فهم الذين قد عرفوا مداخل اللغة وبلاغتها وبديعها، وكانوا يتذوقون فنونها.

ولقد التمستُ الذين يحفظون الحديث بصورة سريعة ومتقنة، فوجدتهم هم الذين أتقنوا العربية نطقاً وقراءةً وفهما، وهذا مما لا يختلف فيه اثنان؛ فإن الناطق بلغة ما يسهل عليه حفظ عباراتها، وعلى العكس من ذلك إن لم يكن ناطقا بها يصعب عليه أن يثبت عباراتها في ذهنه، ولو ثبتت لزالت بصورة سريعة إن لم يحافظ عليها بكثرة الاستعمال. ولقد نزل القرآن بلغة العرب، وعندما كان العرب قد وصلوا الأوجَ في العربية بحيث لم يسبقهم أحد إلى ما

وصلوا إليه لا قبلهم ولا بعدهم، فعندما نزل القرآن ببلاغة وبيان رباني كانوا ينصتون له ويتأثرون به؛ لأنهم كانوا يعظمون الفصاحة والبيان بل يقدسون، فلم يُعرف قوم على أنهم وضعوا أدب ما كتبوه في معابدهم ومقدساتهم كما فعل العرب عندما علقوا المعلقات السبع على أستار الكعبة، وما ذاك إلا لتعظيمهم الكلامَ البليغَ حتى أنهم كانوا يعظمون قائله، ولهذا كانوا يرون القرآن على أنه ليس من كلام البشر بل ينجذبون إليه من غير إرادتهم، فمع أنهم كانوا أعداءَ الدين والرسول عليه الصلاة والسلام إلا أنّهم إذا ما سمعوا القرآن لا يجدون بداً من أن ينصاعوا له ويؤمنوا به حتى قالوا: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ﴾ (فصلت: ٢٦) فمجرد سماع القرآن يدخلهم دين الإسلام قهرا وجبرا، ويدخل القرآن قلوبهم من غير استئذان، فيجرهم إلى الإسلام بقوة الفصاحة والبلاغة اللتين يستشعرونهما في كتاب الله تعالى فلا يشكون على أنه من عند غير البشر.

وهكذا كان صحابة محمد ﷺ فقد ثبت عنهم أن أحدهم إذا سمع القرآن لا يتمالك نفسه حتى تنهمر دموعه، وقد ثبت عنهم أن أحدهم يحيي ليلته قائما لله تعالى بسورة واحدة لما يجده فيها من معاني سامية وعِبَرٍ ومواعظ إلى هذا الحد بلغ فهمهم لكتاب الله تعالى وتأثرهم به.

وهنا نذكر أمراً وهو يجب على الأمة جميعا أن تعلم بأن العربية لغة كل مسلم لا العرب فحسب، وقول الله تعالى عن كتابه: ﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (البقرة: ٢) لا يعني أنه لمتقي العرب نسبا فحسب بل لكل من آمن بالله ربا وبمحمد نبيا، وليس لأحد أن يتخذ كتاب الله تعالى هاديا بصورة مباشرة حتى يعرف العربية جيدا. من ناحية أخرى علينا أن نعلم بأن العربيةَ لغةُ الفطرةِ كما أنَّ الإسلام دين الفطرة. أما كونها لغةَ الفطرة فقد

أخرج ابن أبي الدنيا عن أنس ابن مالك رضي الله عنه أنه قال: قال رسول الله ﷺ: "يدخل أهل الجنة على طول آدم ستون ذراعا بذراع الملك، على حسن يوسف، وعلى ميلاد عيسى ثلاث وثلاثون سنة، وعلى لسان محمد، جرد مرد مكحلون". والحديث قد حسنه العلماء، وهذا الحديث أثبت من حديث "أحبوا العرب لثلاث" فهو حديث قد ضعفه علماء الحديث، وبهذا الحديث يثبت أن لغة أهل الجنة عربية، وبما أن الذي في الجنة لا يتغير؛ فإن لغتها أيضا لا تتغير، وبهذا نعرف أنّ لغةَ آدم عندما خلقه الله وأنزله جنة الخلد على الوجه الأصح كانت اللغةَ العربية؛ لأنه إنما يتكلم إذا أراد أن يتكلم بلغة المكان الذي سكنه. وهناك دليل آخر على أن لغة آدم كانت العربية حيث أخرج الترمذي من حديث أبي هريرة ﷺ عن رسول الله ﷺ أنه قال: "لما خلق الله آدم ونفخ فيه الروح عطس، فقال: الحمد لله، فحمد الله بإذنه فقال له ربه: يرحمك الله يا آدم، اذهب إلى الملائكة إلى ملأ منهم جلوس، فقل: السلام عليكم، قالوا: وعليك السلام ورحمة الله، ثم رجع إلى ربه قال: إن هذه تحيتك وتحية بنيك بينهم ...". قال الترمذي: حديث حسن.

فقوله: "الحمد لله" وقول الله تعالى له: "يرحمك الله" و"السلام عليكم تحية آدمَ وتحية بنيه بينهم" كل هذه الكلمات عربية، وقوله: "تحية بنيك بينهم" دليل على السلام هو تحية بني آدم كما أن دينهم الإسلام دين الفطرة، ولا يستلزم عدم امتثال ذرية آدم لهذه التحية عدمَ الثبوت كما لا يخفى، وقد ذكر ابن كثير في تفسيره لقول الله تعالى: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (البقرة: ٣١) عن ابن عباس أنه قال: عرض عليه أسماء ولده إنسانا إنسانا، والدواب، فقيل: هذا الحمار، هذا الجمل، هذا الفرس. وهذه الأسماء باللغة العربية.

وعندما تكون لغةُ آدم العربيةَ في الجنة فلا غرّ لو قلنا: إن العربية لغةُ الفطرة

كما أن دين الإسلام دينُ الفطرة، ولا حرج لو قلنا: إن الله تعالى إذ كان قد خاطب ذرية آدم بلغة فإنما خاطبهم بالعربية؛ لقوله تعالى: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُواْ بَلَى شَهِدْنَا أَن تَقُولُواْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ﴾ (الأعراف: ١٧٢) نقل ابن كثير في تفسيره أن الشهادة كانت حالا وقالا.

ولو قلنا: إن الشهادة إن كانت قالا فإنما هي بالعربية، والله أعلم؛ لما أسلفنا ذكره من أن لغة الجنة وآدم عربيةٌ، فلا مبالغة أن تكون لغةُ ذريته وهم في ظهره العربيةَ كما أنَّ دينهم وهم في ظهره الإسلامُ. فالعربية لغة الفطرة فضلا عن كونها لغة كل مسلم، وهذا يؤيد ما ذهب إليه بعض لعلماء من أن اللغة العربية لغةٌ توقيفية كما قد نص هذا المذهب ابن فارس في كتابه "الصاحبي في فقه اللغة"، وهذا القول تقرره الأدلة أعلاه، وما قد حظيَتْ به اللغة من بلاغة وبيان فوق مدى صنع الإنسان، ولهذا اختارها الله أن تكون لغة كتابه الذى تحدى به البشر، وعليه يقول الشافعي رحمه الله: لم يحط أحد باللغة إلا النبي عليه الصلاة والسلام.

ورد عن النبي عليه الصلاة والسلام ما يستدل به على أن اللغة العربية هي لغة أهل السماء أيضاً. فقد روي عن ابن عباس رضي الله عنهما عن النبي عليه الصلاة والسلام أنه قال: "كان جبريل يوحى إليه بالعربية وينزل هو إلى كل نبي بلسان قومه"، فهذا الحديث إن ثبت يدل دلالة واضحة أن اللغة المعهودة في السماء هي العربية.

ولك أن تستدل بالحديث الصحيح الذي رواه البخاري في صحيحه عن مالك ابن صعصعة، وفيه "فَانْطَلَقْتُ مَعَ جِبْرِيلَ حَتَّى أَتَيْنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا. قِيلَ: مَنْ هَذَا؟ قَالَ: جِبْرِيلُ. قِيلَ: مَنْ مَعَكَ؟ قِيلَ: مُحَمَّدٌ. قِيلَ: وَقَدْ أُرْسِلَ

إِلَيْهِ؟ قَالَ نَعَمْ. قِيلَ: مَرْحَباً بِهِ، وَلَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ. فَأَتَيْتُ عَلَى آدَمَ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، فَقَالَ: مَرْحَباً بِكَ مِنِ ابْنٍ وَنَبِيٍّ. فَأَتَيْنَا السَّمَاءَ الثَّانِيَةَ. قِيلَ: مَنْ هَذَا؟ قَالَ: جِبْرِيلُ. قِيلَ: مَنْ مَعَكَ؟ قَالَ: مُحَمَّدٌ. قِيلَ: أُرْسِلَ إِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ. قِيلَ: مَرْحَباً بِهِ، وَلَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ. فَأَتَيْتُ عَلَى عِيسَى وَيَحْيَى، فَقَالاَ: مَرْحَباً بِكَ مِنْ أَخٍ وَنَبِيٍّ. فَأَتَيْنَا السَّمَاءَ الثَّالِثَةَ. قِيلَ: مَنْ هَذَا؟ قِيلَ: جِبْرِيلُ. قِيلَ: مَنْ مَعَكَ؟ قِيلَ: مُحَمَّدٌ. قِيلَ: وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ. قِيلَ: مَرْحَباً بِهِ وَلَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ. فَأَتَيْتُ يُوسُفَ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، قَالَ: مَرْحَباً بِكَ مِنْ أَخٍ وَنَبِيٍّ ......".

ففي هذا الحديث خاطبهم النبي عليه الصلاة والسلام الأنبياءَ، وخاطبوه بالعربية من غير ترجمان، ولم يعرف عنه أنه يعرف غير العربية. وبهذا يثبت أن لغة أهل السماء أيضا عربية، وحق لها ذلك فهي لغة التسبيح والتحميد والتهليل، وهي لغة كلام الله تعالى في كتابه المعجز الخالد الذي تحدّى به الجنَّ والإنس. وفوق ما للعربية من منزلة أنها لغة دين الإسلام الذي لا يقبل الله دينا من العباد سواه، وهو دين الفطرة كما قال عليه الصلاة والسلام: "كل مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه." وقد نزل باللغة العربية، فلا ضير أن تكون العربية لغة الفطرة، وهي كذلك كما أسلفنا لما فيها من سلاسة النطق ويسر التلفظ. وقد اتضح هذا بالتجربة حيث نرى الطفل الذي لم يبلغ التاسعة من عمره بعدُ ولا يعرف العربية يعي كتاب الله في صدره ويحفظه، ولم يكن قادرا أن يحفظ كتابا بلغة أخرى ولو كانت لغته. قال الله تعالى في كتابه: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر: ٢٢) فإذا كان القرآن ميسرا ببلاغته وفصاحته وقوة عبارته فالعربية التي هي لغته من باب أولى أن تكون ميسرة وقد ثبت بالتجربة أن متعلّم العربية إذا بدأ بتعلم

العربية بحيث يتعلمها من أبواب تعلمها، فإنه ينطلق لسانه في مدة يسيرة، وقد لا يكون هذا مع لغة أخرى. وخاصة للمسلمين فهم يتكلمون بالعربية على الأقل خمس مرات يومياً عندما يصلون.

ولعل أحداً يسأل ما لنا لا نقوى على التكلم بالعربية، لماذا لا يتكلم العلماء والطلاب بالعربية؟ فالجواب هو أننّا دخلنا على العربية من غير أبوابها، دخلنا عليها بالنحو والصرف، والنحو والصرف لا يُعَلّمان العربية، دخلنا من "ضَرَبَ يَضْرِبُ ضَرْباً فهو ضارِبٌ" فالصغير ليلاً ونهاراً يُردد هذه الكلمات، وعندما يريد أن يتكلم ولا يجد نفسه قادرا على التكلم يشمئز ويتشاءم من العربية حيث يرى نفسه قد بذل جهدا كافيا لتعلم أية لغة ولكنه لم يصل بغيته في العربية فيصل في صميم نفسه إلى أن العربية صعبة المرتقى ولا يبلغها أحدٌ. ولم تعرف هذه الطريقة عند الصحابة وغيرهم في تعليم العربية بل كانوا يكلّمون الناس بها في معاملاتهم ومحاوراتهم الدعوية والتجارية، ولقوة دينهم وحسن خلقهم وإخلاصهم أحبهم الناس، ودخلوا في دينهم وتعلموا العربية منهم خاصة بعدما علموا أن فهم الدين موقوف على تعلمها، ولم يكن هناك نحو وصرف. فالنحو والصرف لا يعلمان العربية بل يعلمان الفصاحة ولم تؤلف الكتب فيهما لغير الناطقين بها بل وضعا لمن ينطق بها فوضعت القواعد محافظة على اللغة من التغيير خاصة بعدما دخل العجم فيدين الله وظهر بعد التغيير في العربية، ولا نعني بهذا الكلام تقليل شأن النحو والصرف بل لا ينال الطالب درجة الفصحاء فيعصرنا هذا حتى يتعلم قواعد النحو والصرف؛ فإن أحدا في الأرض لم يكن متكلما بالفصحى، وقد خلت الأرض تماما من مجتمع ينطق باللغة العربية الفصحى، ولعل هذا من مكر أعداء المسلمين حيث لا تكاد تجد مجتمعا أو محيطا أو بيئة في الدنيا ممن ينطق

بالعربية الفصحى، وقد استعملوها في حياتهم اليومية، فإذا ثبت افتقارنا لمجتمع ينطق بالعربية الفصحى التي كان عليها العرب في زمنه ﷺ وجب علينا أن نعرف ما نميز به الخطأ من الصحيح، ولا يكون هذا إلا بمعرفة القواعد النحوية والصرفية كي تكون معيارا للكلام الفصيح؛ فإن النحو والصرف مهمان لمن أراد أن يكون فصيحا، وعلى هذا على المعلم أولا أن يعلم طلابه اللغة العربية أعني لغة الواقع الذي يعيشه الطالب ثم يعلمه القواعد النحوية والصرفية ليصبح فصيحا.

والجدير بالذكر هو أن الفصاحة لا تتأتى بمعرفة القواعد فحسب بل على المتكلم أن يطبع لسانه عليها، فلا ينطقن بكلام غير فصيح مهما كان؛ لأن النحو يصون الذهن عن الخطأ اللفظي. وأما صيانة اللسان فهي تتحقق بصيانة الذهن واللسان حتى يعتاد اللسان على الفصاحة. ومن أهم الأمور التي تأثر على اللسان في فصاحته هو السماع، فلو سمع الإنسان الخطأ وسكت عنه، فإنه سيقع فيه ولو بعد حين، وإن كان عالما به أنه خطأ، فمثلا كلنا يعلم أن كلمة "ضروري" تتلفظ بالضاد لا الزاي ولكن لكثرة ما نسمع هذا الخطأ ونسكت عنه وقعنا فيه مع علمنا به، فالذهن مصان من هذا الخطأ ولكن اللسان لم يعتد على الصواب فيه. فالأصل تطبيع اللسان على الفصاحة.

وكذلك قد يعرف الطالب أن الفاعل مرفوع ولكنه قد نصبه في كلامه، فالصيانة التي يحدثها النحو إنما تكون في الذهن لا اللسان، وأن ما في الذهن بعد معرفة القاعدة لا يتغير، وأما اللسان فهو تبع لما اعتاد عليه بالتطبع والسماع. ومن الأمثلة المعروفة عندنا في باكستان أننا نعلم أن معنى "كسير" المكسور، و"كثير" الوافر مع علمنا بهذا نقول: "كسير" ونريد به "كثير" مع الفرق الواضح في المعنى حتى لو أن أحدا أراد أن يثني على أحد فيقول له:

"كسر الله أمثالك" بدل "كثر الله أمثالك".

ومما يلفت النظر أن الطالب للأسف الشديد يدرس أربع سنين النحو والصرف. لم؟ للعربية، ولكن لا عربية، وذلك لأن الغاية من النحو هو صيانة الذهن من الخطأ اللفظي في كلام العرب، ولا تكون الصيانة إلا عند وجود الألفاظ العربية لما يتكلم. أما وهو يتكلم بغير العربية فأنى له الصيانة، فإن عدمت الصيانة انعدمت الغاية، وفن لا غاية فيه كالمعدوم، ولا زلنا نكرر أن النحو في الكلام كالملح في الطعام، وها نحن نأخذ الملح ونذر الطعام، ولا شك أن الملح لا يستساغ وحده، فتركناه أيضا وفقدنا الأمرين.

الخلاصة أن النحو يعلم الفصاحة ولا غنا عنه، والفصاحة تتأتى به وبالسماع، فمن سمع الفصيح يفصح، ومن سمع اللحن لحن، وكل ذاك بتطبيع اللسان وتعويده، ولهذا كان العرب يرسلون أبنائهم إلى البادية لكي يتعلموا العربية القحة الخالية من كل لحن، فإذا تطبعت بها ألسنتهم فكأنها نقشت في صدورهم، فلا ينطقون إلا بالفصحى، وذلك لأن المدن عادة يرتادها الأجانب وغير العرب فقد يصدر من أهلها اللحن.

فسماع الفصاحة أصل فتعلُّم الفصاحة والسماع لا يتأتى إلا بعد أن نقيم بيئة عربية فصحى. ولا يقولن أحد: إننا في باكستان، وباكستان لم تكن بلداً عربياً كي نقيم فيها العربية، فالكل يعلم أن لغة باكستان الرسمية ليست الإنجليزية، ومع هذا أقيمت الإنجليزية في المدارس الدنيوية بل كثير من البيوت ممن لا يتحدث في البيت إلا بالإنجليزية مع أن المصلحة التي تقتضيها الإنجليزية مصلحة دنيوية، وليس لها من الآخرة من نصيب. ثم يجب أن نعرف معاشر الإخوة! أن العربية لغة كل مسلم نطق بلا إله إلا الله محمد رسول الله، وليست لغة العرب فحسب، والعزم والحزم كفيلان بإقامة البيئة العربية.

معاشر العلماء! مما لا يخفى عليكم أن العبد لم يخلق لبلده أو قومه، وإنما خلق لعبادة الله تعالى كما قال تعالى: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاريات: ٥٦). والعبادة لا تنزل منزل القبول حتى تكون تحت شرع الله ودينه، وبعد بعثة النبي عليه الصلاة والسلام لا يقبل الله دينا سوى الإسلام فكأن العبد خلق للدين، والدين الذي يرتضيه الله هو الإسلام فكأنه خلق للإسلام، وديننا نزل على النبي عليه الصلاة والسلام باللغة العربية فلا يفهم إلا بها بل يجب أن يتكلم بالعربية كي يتمكن من تدبر كتاب الله تعالى ويخشع في صلاته؛ فإن الصلاة لا تقبل إلا بالعربية ولكي تعرف أهمية التكلم بالعربية، فإنك ترى من كان متكلما بالعربية ويستعملها بصورة مستمرة عندما يصلي بالناس فإنه يتأثر بكتاب الله تعالى عند قراءته، وقد يبكي. أما الذي لا يستعمل العربية فقل ما يتأثر بالقرآن ولو كان يفهمه. وإن أردت مثالا فلك أن تسأل عن أئمة العرب وأئمة العجم، ولا يعني هذا أن العرب أتقى من العجم بل قد تجد من الورع والتقى عند العجم ما لا تراه عند العرب. فالتكلم بالعربية له أثر كبير فيتدبر كتاب الله تعالى والخشوع في الصلاة، فلم يكن تعلُّم العربية والتكلم بها محصورا على العلماء وطلبة العلم فحسب، بل هو عام لكل مسلم، وليس الأمر بالصعب؛ فإن كل مسلم يتكلم بالعربية في اليوم والليلة على الأقل خمس مرات عندما يصلي، وكذلك يذكر الله تعالى بالعربية ويسمع الأذان بالعربية ويقرأ القرآن بالعربية. فالعربية أقرب إلى المسلم من جميع اللغات، و لم تكن أجنبية عليه فلا يحتاج من الوقت في تعلمها ما يحتاجه في تعلُّم اللغات الأخرى، وقد جربنا هذا في أماكن عدة من باكستان.

معاشر العلماء وطلبة العلم! أنتم الذين من الممكن أن توصلوا هذه اللغة إلى عامة الناس ولا يسعكم أن تمنحوا شيئا لا تملكوه، فعليكم أن تتكلموا

بالعربية أينما كنتم، ثم بتكلمكم في مجالسكم، يتعلم عامة الناس، ولا نشك أن التكلم بالعربية مفخرة وعزة للمسلم؛ فإن الله أنعم على المسلمين بلغة الإسلام كما أنعم عليهم بدين الإسلام، فلا ينبغي لأحد منكم أن يميل إلى غير العربية. ثم اعلموا أن الميزة الوحيدة التي يمكن أن يمتاز بها العلماء في باكستان هي التكلم بالعربية الفصحى، فلا تجد أحدا من عامة الناس من يستطيع أن يشارك العالم بها. أما أولئك الذين يذهبون للعمل والكسب في الدول العربية فهؤلاء يتعلمون لغةً ليست عربية فصحى ولا عامية، بل هم يتكلمون بلغةٍ غير مستعملة بين العرب، والأردية أفضل منها بكثير، وليس لها من العربية الفصحى من حظ ولا نصيب.

فيا معاشر العلماء! زينوا مجالسكم باللغة العربية الفصحى كي تثبتوا العلم في أنفسكم، وتأكدوا القواعد النحوية التي طالما أنفقتهم في قراءتها وفهمها الأيام والليالي، ولتكونوا قدوة لعامة الناس.

فمن للناس في تعليم لغتهم الدينية إن لم يتعلموها منكم؟ أتدرون أن بعض الناس ممن لا يعرف شيئا من صلاته من التكبير إلى السلام؟ هذه العبادة التي هي الركن الثاني بعد الشهادة أليس هذا يكمد القلب بأن العبد يتقرب إلى معبوده بأقوى العبادات ولا يعرف ماذا يقول لمعبوده؟ كل دين على حد ما نعرف أهله يتعبدون إلههم بلغة يفهمونها وإن كان ذاك الإله باطل.

أليس المسلمون أحق بأن يعبدوا ربهم الحق بلغة يعرفونها؟ أتعلمون أن اليهود قد وحدوا لغتهم وهي العبرانية، فيكل العالم، فلا تكاد تجد يهوديا فيكل العالم إلا ويعرف العبرانية، ولا شك أن للغة أثراً فيجمع الكلمة وإن اختلفت العقائد والأصول، وإذا اختلفت تكون سببا لتفريق الكلمة وإن اتفقت العقائد والمذاهب. وإذا أردت أن تعرف مصداق هذا الكلام فلك

أن تقيس على الأوضاع المتدهورة في كراتشي، وسبب التقاتل والتناحر الذي يقع في هذه المدينة بصورة مستمرة حيث لا أحسبك تجد سببا مقنعا سوى اختلاف اللغة.

فهلموا يا لبارك الله فيكم إلى تعريب مدارسكم ومجالسكم ليرفعكم الله في قلوب المسلمين، ولتكونوا قدوة لغيركم فيما التزمتم به، واعلموا أن باكستان أرض خصبة حرة، من الممكن أن تقام بها العربية الفصحى بل احتمالية إقامة العربية الفصحى فيها أقوى منها في الدول العربية، وذلك أن الباكستاني إذا أراد أن يتعلم اللغة فليس له إلا الفصحى. أما الدول العربية فقد تشتت باللهجات، وما أن يكلمك أحد إلا ويميل إلى لهجته العامية.

ومما تجدر الإشارة إليه أن هذه المدارس أعني المدارس العربية التي مَنَّ الله تعالى على هذا البلد بكثرتها هي التراث الوحيد الذي بقي للمسلمين حيث لم يبق تراث لهم إلا وقد تدخلت به أيدي الحكومات فهو التراث الذي لم تعبث به الأيدي وبقي حرا أبيا فهي عبارة عن مؤسسات إسلامية حرة، وقد ندر هذا في العصر الراهن فقلما تجد مدرسة أو جامعة أو مؤسسة لا تنضوي تحت سطوة الحكومة. ومما لا يخفى على أحد أن أعداء الأمة يسعون جاهدين للحيلولة دون انتشار وتقدم هذه المدارس ولكن يمكرون ويمكر الله والله خير الماكرين. فكان يجب علينا أن نرقيها خاصة وقد كتبنا على أبوابها بلوحة كبيرة: "المدارس العربية". وإذا ما دخلت فلا تكاد تسمع العربية إلا من الكتب للأسف الشديد.

ولا يقال: كيف لنا أن نعرب المدارس ونحن في بلد أعجمي فقد أسلفنا الذكر أن بعض المدارس الدنيوية ممن أقام الإنجليزية فيها حتى الحارس تجده يتكلم بالإنجليزية، وترى طلبة تلك المدارس يتباهون ويتفاخرون عندما

يتكلمون بالإنجليزية، ويرى أحدهم أن التكلم بغير الإنجليزية عيب كبير، والأنكر من ذلك والأعتى أنك تجد في هذا البلد الإسلامي الذي بدت فيه مظاهر الإسلام وعلت والحمد لله والمنة بكثرة المدارس وطلبة العلم والدعاة الذين انتشروا في كل مكان فلا تكاد تجد بلدا أقوى منه دعوة وانتشارا للدعاة وطلبة العلم. تجد فيه للأسف الشديد عوائل ليست قليلة تستعمل اللغة الإنجليزية في البيت، ولا ترضى سواها، وبالمقابل لا تجد بيتا واحدا من بيوت العلماء وطلبة العلم ممن جعل لغة بيته اللغة العربية أو ندر ما تجد، هل الإنجليزية أقوى من العربية أم هي أقرب إلى الأردية من العربية؟ كلا وحاشا فإن اللغة الأردية جل ألفاظها عربية، ولو أردت أن تخرج الألفاظ العربية لما بقيت الأردية لغةً، وهناك ألفاظ كثيرة مشتركة بين العربية والأردية بنفس المعنى، وهناك ألفاظ مشتركة بمعاني مختلفة.

ومما لا شك فيه أن أعداء الأمة علموا أن للغة أثراً كبيراً جداً على ثقافة الناس وتصرفاتهم، فقد حاولت فرنسا أن تغير دين الجزائريين فلم تستطع، وكلما حاربتهم فيدينهم ازدادوا صلابة وتمسكا، ولكن عندما غيرت لغتهم تغير دين كثير منهم حتى بلغ الحال عند بعض الذين تركوا دينهم من المسلمين بعدما تكلموا بلغة الكفار، بلغت به الحال أنه لا يرضى أن ينسب إلى الإسلام ولو من طريق أجداده وآبائه. فانظر يا بارك الله فيك إلى أثر اللغة على حال الإنسان.

إن اللغة إذا انتقلت إلى قوم نقلت معها ثقافة أهلها، ولهذا تجد كل من يتكلم بلغة قوم يميل إليهم خاصة بعدما يتقنها إلا أن يكون تعلمه لها لدعوتهم أو لأمر ديني، وهذا قليل فيعصرنا الحاضر.

ومما يؤسف لذكره هو أنك ترى مجالس أهل الدنيا إذا اجتمعوا يأبى أحدهم

أن ينطق بغير الإنجليزية وإن كان ضعيفا فيها، وترى بعضهم يتعسف بالتكلم بها ويتناسى أنه بنجابي أو سرايكي، بشتوني أو مهاجر، وبالمقابل ترى مجالس العلماء وطلبة العلم الشرعي كل يتكلم بلغة قومه إذا ما اجتمعوا في مجالسهم، وكل واحد يرى ذلك فخرا للأسف الشديد حتى قد تراهم لا يجتمعون على لغة البلد أعني الأردية، ولو أنهم تكلموا بالعربية لازداد شأنهم ارتفاعا في الدنيا والآخرة، ولعلت منزلتهم في قلوب الناس، وقد رأينا هذا وجربناه حتى عندما أرسلنا الطلاب للدعوة في المساجد وقد رغبناهم بأن لا يتكلموا إلا بالعربية أين ما كانوا فعندما يسمع الناس كلامهم يتساءلون هل أنتم عرب؟ فيقولون: لا، إنما نحن طلبة علم، فما هم عليه من التكلم بالعربية يكرمون أيما إكرام لحبهم لغة نبيهم وكتابهم، فالناس متعطشون لسماع العربية، وعلينا أن نعرف أنه ليس من ميزة العلماء أن يتكلموا بالإنجليزية، وإنما ميزتهم عند المسلمين وغير المسلمين أنهم ينطقون بلغة دينهم الذي صاروا علماء فيه. فلو لقي كافر مسلما ثم بدى له أنه عالم، ثم علم أن لغة الدين هي العربية، واتضح له أن هذا العالم لا ينطق بالعربية فلا يمكن أن يقرّ له علما وإن كان ذاك العالم ناطقا بالإنجليزية؛ لأن ميزة كل عالم إنما تتجسد في لغة دينه، فالقس الذي لا يعرف لغة كتابه ودينه لا يُعترف له بعلم، وكذلك الحبر عند اليهود. هذا، وقد ترجمت كتبهم حتى صار أحدهم يتقرب إلى ربه بقراءتها بتلك اللغة. أما المسلمون فليس لأحد أن يرى قراءة القرآن بغير العربية قربة إلى الله، فالمسلمون أخص من غيرهم بلغتهم، فهم أولى بأن يتعلموا وينطقوا بلغة دينهم من غيرهم.

يقول الله تعالى ﴿ءَاعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ﴾ (فصلت: ٤٤). يقول القرطبي رحمه الله في تفسيره: العجمي الذي ليس من العرب كان

فصيحا أو غير فصيح والأعجمي الذي لا يفصح كان من العرب أو العجم، فالعربي الذي يمتاز عن غيره فيفهم القرآن هو ذاك الذي ينطق بالعربية الفصحى وإن لم يكن منسوبا للعرب حيث لا عبرة في النسب لفهم كتاب الله تعالى، فكل من يحسن العربية عربي وهو الذي يمكنه أن يصل إلى ما في كتاب الله وسنة رسوله.

وهنا ينبغي أن نفرق بين فهم العربية والنطق بها؛ فإن البيان لا يكون إلا لمن نطق بالعربية كما قال تعالى: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (إبراهيم: ٤). فقد قيد البيان في اتحاد اللسان بين النبي وقومه ونحن من قوم النبي عليه الصلاة والسلام؛ فإن قوم النبي هم الذين أرسل إليهم ونبينا قد أرسل إلى كافة الناس، فإذا أردنا أن نبلغ غاية البيان فعلينا أن نتوحد معه عليه الصلاة والسلام في الكلام وليس من الممكن أن يتكلم النبي بلغتنا فما بقي لنا إلا أن نغير لغتنا لتوافق لغته عليه الصلاة والسلام لننال البيان في فهم الكتاب والسنة على الوجه الصحيح المرضي.

معاشر العلماء والطلبة! لقد قرأتم في مدارسكم النحو والصرف سنين طوال، واستطعتم أن تفهموا الكتب التي لا يقوى على فهمها بعض العرب، وتناولتم كتب الأدب حتى لم تبق عبارة أدبية أو بلاغية يصعب فهمها على الواحد منكم قرأتم "المعلقات السبع" التي تستصعبها الجامعات العربية، وقرأتم "المتنبي" و"الحماسة" وغيرها من الكتب القديمة التي حوت اللغة بكل معانيها، فلم يبق بينكم وبين العربية إلا النطق بها، ولما لم تنطقوا بالعربية كانت جريمة هذا نسيان القواعد فلم يصل الطالب إلى الصف الخامس إلا وقد نسي القواعد التي قرأها في الصفوف الماضية، ثم عندما يتناول الأدب فما أن يصل الصف السابع ويبدأ بالحديث إلا وقد نسي الأدب. أما لو استعملتم العربية

في حياتكم اليومية في المدرسة لاستطعتم أن تحافظوا على تلك القواعد والعبارات الأدبية من خلال استعمالها بل قد يرتقي أحدكم أدبا وبلاغة كلما ارتقى في الصفوف، وكل هذا موقوف على استعمال العربية.

وعلينا أن نعرف أن الكتب التي ندرسها في مدارسنا باللغة العربية ورسم عباراتها كذلك، وهذه العبارات سواء كانت في الفقه أو أصوله إن لم يكن قارئها يتكلم بالعربية لا تستقر في الذهن، ولا يمكنه أن يستشهد بها، وهذا الأمر طبعي؛ فإن الإنسان يحفظ عبارات لغته بسرعة وتثبت في ذهنه ويستعملها. أما العبارات التي بلغة لا يتكلم بها فلا يستطيع أن يحفظها بسرعة، وأيضا لا ترسخ في الذهن، فمثلا لو عرضت عبارة على أحدكم بالأردية فقد يحفظها من القراءة الأولى أو من مرتين أو ثلاث ثم يبقى يذكرها في كلامه فتبقى في ذهنه. أما لو عرضت عليه عبارة بلغة لا ينطق بها فإنه من الصعب أن يحفظها أو يرسخها في ذهنه، فلهذا نرى الطالب بعد تخرجه من الدورة لم يحفظ تلك العبارات ولا يستطيع أن يستشهد بها. ومما يؤسف هو أن بعض الطلاب يتخرج من الدورة وقد قرأ أكثر من عشرين ألف حديث ولم يحفظ حديثا واحدا منها. ولا أعزو السبب إلا لعدم التكلم بالعربية، ولو أنه تكلم بالعربية لاستطاع أن يحفظ العبارة، ومنها الحديث، وأيضا لاحتاج أن يستشهد بالحديث في كلامه في الوعظ أو المناقشة. وبهذا يكون قد حافظ على ما حفظ وازداد حفظا بحفظ ما لم يحفظ.

ولهذا عندما يذهب بعض طلبتنا إلى الدول العربية يستحيي أن يلتقي أحدا من العلماء أو طلبة العلم خشية أن يكلمه بالعربية ولا يستطيع أن يجيبه، وإذا كان ناطقا فلا يكون متقنا للعربية، ويبدو ضعيفا أمام العرب، ثم علم حفظه للحديث يجعله هزيلا أمام أولئك العلماء مع أنه عالم ولكن علمه مكمون في

بطون الكتب، فإذا فتح الكتاب فهو بحر لا ساحل له، وإذا انطوى الكتاب انطوى علمه، لا لضعف فيه ولكنه لم يعتد حفظ العبارة؛ لعدم استعماله العربية فيستعمل تلك العبارة أثناء كلامه، ولعل هذا هو السبب الذي أحدث فجوة بين العلماء في باكستان وعلماء العرب مع أن كلا محتاج إلى صاحبه، فالأمة لا ترتفع إلا بالتعاون في كل شيء.

ومن العجب أن يدرس الأدب العربي باللغة الأردية؛ لأن الأدب بألفاظه ومعانيه، فإن تغيرت الألفاظ لا يبقى أدبا كاملا، وإن بقيت المعاني فهل لأحد أن يستحسن الأدب الأردية إذا ترجم إلى العربية؟ ثم لو علمت أن مدرسة ما تدرّس الكتب بلغة غير لغة الكتاب. أما تحكم عليها بالفشل؟ ولو سمعت أن مدرسة دنيوية تدرس الكتب الإنجليزية باللغة الإنجليزية. ألا تحكم عليها بالنجاح؟ فما لنا لا نرضى أن تدرس الكتب الإنجليزية إلا بالإنجليزية ونرضى أن تدرّس الكتب العربية باللغة الأردية.

وأريد أن ألفت نظركم إلى أمر وهو أنكم قد قرأتم الأدب العربي أكثر مما قرأتم أدب لغتكم الأردية. أليس كذلك؟ فلا أرى أن واحدا منكم قد قرأ أدب الأردية كما قرأ أدب العربية، بل إن أحدكم قد امتلئ صدره بالألفاظ والمعاني العربية ما لم يمتلئ مثلها بالأردية، فالعربية أقرب إلى أحدكم من الأردية، فما عليكم إلا أن تخرجوها من صدوركم إلى حلوقكم ثم ألسنتكم، ثم لو محص أحدكم كلامه أثناء تدريس الكتب العربية فاللغة الأردية لوجد أكثر كلماته التي يستعملها عربية، ولكنها محوّرة إلى الأردية، ولو أنه استعمل العربية لكفى الطلاب مؤونة فهم الكتاب بالترجمة، ولاستغنى عن وقت الترجمة الذي كثيرا ما يؤخر المدرّس في تدريسه. ولعل البعض يقول: نحن ندرسهم بالأردية ولا يفهمون فكيف لو درسناهم بالعربية؟ فأقول: إن لم

يفهموا مادة الكتاب بالأردية فالأولى أن يدرسوا بالعربية كي إذا فاتتهم المادة فعلى الأقل يدركون اللغة الدالة على المادة، وقد لا يفهم الطالب في الأسبوع الأول ولكنه سيفهم في الأسبوع الثاني إذا واظب المدرس على التكلم بالعربية، وبعد شهر يتعلم الطلاب العربية فهما ونطقا.

ويجب أن يكون تدريس الأدب تدريجيا تبعا للتكلم فلا يدرس الطالب أدبا فوق ما يستعمل كي يستطيع أن يتفاعل مع ما يقرأ فيأتي في تكلمه ما يماثل ذلك الأدب أو دونه شعرا كان أو نثرا. وبهذه الطريقة يكون الطالب قد سلك سلم الرقي في الأدب في نفسه. أما أنه يقرأ "المتنبي" و"الحماسة" وهو لا يعرف أن يجيب لو سئل ما اسمك، فهذا لا يعقل، فالأجدر أن يتعلم لغة المحادثة ثم يتصفح بالنحو والصرف ثم يبتعد عن الأخطاء التي تأتيه من ترجمة اللغة الأردية إلى العربية ثم يتأدب حسب ما يقرأ، وهكذا يعلو كلما علا الكتاب الأدبي الذي يقرأه، وهذا التدريج ينبغي على ما أرى يجب أن يتبعه العرب أيضا في تدريسهم للأدب، فأولا يجب على العربي أن يتعلم الفصاحة في كلامه، ولا بأس أن يزامن فصاحته شيء من الأدب ثم يرتفع أدبا في تكلمه كلما ارتفع في الكتب التي يقرأها.

وعلينا أن نعرف أن المنهج النظامي في غاية الدقة في تنسيق كتبه مع الصفوف التي يحويها، فلم يضعه إلا علماء فطاحل، وقد زاد براعتهم دقة أخلاصهم ومدى محبتهم العلم وأهله، والتضحيات التي قدموها لنصرة دين الله، فليس العيب فيه إنما العيب فينا نحن، فلو دُرّس هذا المنهج بالعربية فما أكثرَ نفعه، ولتخرج به علماء لا يضاهيهم أحد، وينافسون العرب والعجم في علمهم، ولأصبحوا أدباء في اللغة، ولعلَتْ بلاغتهم؛ فإن الكتب المختارة في هذا المنهج في غاية الفصاحة والبلاغة، فلم يؤلف كتاب "كنز الدقائق" إلا

من قد برع في اللغة فضلا عن الفقه، فيمكن أن تقول: إنه كتاب فقه وبلاغة. وهكذا "الهداية" و"نور الأنوار" وجميع الكتب لو اطلعت على عباراتها لوجدتها في منتهى البلاغة البشرية، فإذا لم يكن السبيل الوحيد للأدب والبلاغة كتب الأدب بل جميع كتب هذا المنهج تعلم الطالب الفصاحة والبلاغة والأدب ولا تجد في الدنيا الآن من يستعمل مثل هذه الكتب في تدريسه.

ثم بعد هذا التدرج في اللغة يصل إلى دورة الحديث ويقرأ فيهما كتب الحديث المعروفة، وعندها سيشعر فصاحته عليه الصلاة والسلام من خلال قراءة الحديث. وعلينا أن نعلم أنه لم يخلق أحد أفصح من النبي عليه الصلاة والسلام لا قبل بعثته ولا بعدها، بل لم يصل أحد إلى مستواه أو يقربه في الفصاحة والبيان، فلا يخلو شاعر أو أديب من نقد، إما لغوي أو خلقي أو عقائدي. أما الرسول عليه الصلاة والسلام فليس لأحد أن يفكر بنقده عليه الصلاة والسلام فهو نبي اللغة، ولو خالفت القاعدة النحوية حديثه فالمعتبر حديثه وتترك القاعدة، وكان عليه الصلاة والسلام يذكر الحديث الواحد بعدة أساليب. وإن أردت أن تعرف هذا فلك أن ترى أحاديث ليلة القدر بل كان يسأل الصحابة عن اللفظ وهم أفصح العرب ولا يعرفونه، فالطالب عندما يكون قد تدرج في الأدب بكلامه وكتابته يستذوق حديث النبي عليه الصلاة والسلام، ويحفظ عبارته بكل سهولة؛ فإن الصحابة رضي الله عنه كانوا يحفظون حديثه من السماع الأول، وذلك لأنهم كانوا فصحاء بلغاء. ولهذا على الطالب أن يكثر من حفظ الحديث لدينه وللغته. وثبات الحديث موقوف على استعمال اللغة العربية.

عندما يتكلم الطالب بالعربية في محيط مدرسته فكأنه في درس مستمر؛ لأنه

لا يسعه أن ينطق بعبارة فصيحة حتى يستحضر القواعد في ذهنه، وإذا أخطأ نبهه أخوه، وقد يكون بينهما نقاش نحوي، فيتبادلان المعرفة النحوية والصرفية، وبهذا يصبح الجو الذي يعيشه الطالب في المدرسة جوا علميا، وعلى العكس من ذلك لو تكلموا بالأردية فليس منهم من أحد يرتفع أدبا حتى بالأردية؛ لأن الأدب الذي يقرؤه عربي فلا ينتفع من الأدب العربي؛ لعدم استعماله، ولا من أدب اللغة الأردية؛ لعدم دراسته ومعرفته. ثم وبلا شك عندما تصبح بيئة المدرسة بالعربية تماما فإن التعصب القومي يضعف ويتلاشى بين الطلاب. وإذا سادت العربية فيما بينهم فلا يدرى هل هذا بنجابي أو بشتون أو سرائيكي، وقد رأينا هذا واضحا جليا عندما سادت العربية في قسم التخصص تماما.

ولقد التقيت أفريقيا في مكة ووجدته يحسن العربية فقلت له: كيف تعلمت العربية؟ فقال: أنا لست طالب علم ولكنني أجالس العلماء فتعلمت منهم. فقلت: وعلمائكم بأية لغة يتكلمون؟ فقال: إذا اجتمعوا لا ينطقون إلا بالعربية مع أن اللغة الرسمية هي الإنجليزية، ولهم لغات قومية كثيرة. فالعامة يمكنهم أن يتعلموا العربية عندما يستعملها العلماء، ولعدم استعمالها للأسف الشديد تجد بعض العامة لا يمكنهم أن يتعرفوا على لغة دينهم حتى لو تحدث أحد بالعربية يسأله ما هذه اللغة التي تحدثت بها أهي فارسية أم ماذا مع أنه ينطق بالعربية في اليوم والليلة خمس مرات، فقد أصبحت العربية لغة أجنبية عند العامة، وما ذاك إلا لعدم استعمالها.

فيا معاشر الأحبة! لا تتوانوا في إقامة العربية في مدارسكم، فلو عربت هذه المدارس لتغير مجرى تاريخها، ولأصبحت علما بارزا للمسلمين في كافة أنحاء الأرض، ولقصدها طلبة العلم من كل حدب وصوب من داخل وخارج

پاکستان، والله ولي التوفيق وهو يتولى الصالحين.

نسأل الله تعالى لنا ولكم السداد والإخلاص في القول والعمل كما نسأله أن يحيينا على فعل الخير حيث ما كان وكنا، ونسأله أن يحفظنا وإياكم بالإسلام والقرآن كما نسأله أن يوفقنا للتكلم بالعربية ويرزقنا الفصاحة لنكون أكثر خشوعا في الصلاة وأرغب في فهم كتابه، إنه على كل شيء قدير، وبالإجابة جدير، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.